قرآن مجید میں مُعَرَّب[1]

ڈاکٹر سراج الاسلام حنیف*

ABSTRACT

It is an interesting fact that there is a number of words in the Qur'ān which root is not Arabic. Although it has been a controversial issue among the scholars whether the Holy Qur'ān includes any word from other languages or not, the existence of such type of words is admitted generally. The resent article touches in short this controversy and supports in detail the view of existence of such type of words in the Holy text.

اہلِ عرب پر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت وعنایت ہے کہ اُس نے قرآن مجید کو عربی زبان میں اُتارا تاکہ اُن کو اِس کلام کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، اس لیے اُس نے یہ اعلان فرمایا کہ: ﴿ إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ قُرۡءَٰنًا عَرَبِيّٗا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُونَ ﴾[2] (ہم نے اِس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا تاکہ تم سمجھو۔) یہ خطاب اہلِ عرب سے عموماً اور قریش سے خاص طور پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا تم پر عظیم احسان ہوا ہے کہ اُس کی یہ سب سے بڑی نعمت تمھاری عربی زبان میں نازل ہوئی ہے تاکہ تم اس کو سمجھو، اس کی قدر کرو اور اس کو دوسروں تک پہنچاؤ اور اُن کو سمجھاؤ۔ یہ اس کتاب کے کتابِ مبین ہونے کا ایک پہلو ہے اور اس میں قریش کے لیے ایک دھمکی بھی ہے کہ اگر تم نے اس نعمت کی قدر نہ کی تو تم سے بڑا بد قسمت بھی کوئی اور نہ ہو گا، یہ جتنی بڑی نعمت ہے، ناقدری کی صورت

۱- اسمِ صفت ہے، وہ لفظ جسے عربی بنایا گیا ہو اور دراصل وہ لفظ کسی دوسری زبان کا ہو۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، عبدالولی خان یونی ورسٹی، مردان (sirajulislam@awkum.edu.pk)

۲- یوسف: ۲

میں اتنی بڑی مصیبت کے مستحق ٹھہروگے۔﴿ كِتَٰبٌ فُصِّلَتْ ءَايَٰتُهُۥ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴾[۳] (یہ ایسی کتاب ہے کہ اس کی تفصیل عربی قرآن کی صورت میں اُن لوگوں کے لیے کی گئی ہے جو جاننا چاہیں۔) ﴿ إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴾[۴] (ہم نے اِس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا ہے تا کہ تم سمجھو۔)

قرآن مجید کا عربی میں اُتارا جانا اہلِ عرب پر ایک عظیم احسان بھی تھا اور ایک فیصلہ کن اِتمامِ حجت بھی۔ احسان کا پہلو تو بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری اور کامل ہدایت اُن کی زبان میں اُتاری کہ وہ بلاواسطہ غیر اس سے کسبِ فیض کر سکیں، دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کا انھیں رہینِ اِحسان نہ ہونا پڑے، بلکہ دوسرے اُن کے زیرِ اِحسان بنیں۔ اِتمامِ حجت کا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی اپنی زبان میں اپنی ہدایت نازل کر کے اُن کا ہر عذر ختم کر دیا ہے اور اب وہ عند اللہ یہ عذر نہیں کر سکتے کہ مخاطب عربی اور کلام عجمی! ﴿ وَلَوْ جَعَلْنَٰهُ قُرْءَانًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا۟ لَوْلَا فُصِّلَتْ ءَايَٰتُهُۥٓ ءَا۬عْجَمِىٌّ وَعَرَبِىٌّ ﴾[۵] (اور اگر ہم اِس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اُتارتے تو یہ لوگ یہ اعتراض اُٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلام عجمی اور مخاطب عربی!)

قرآن مجید سے اِعراض و فرار کے یہود مختلف بہانے پیدا کرتے تھے، جن میں سے بعض کو سورۃ حم السجدۃ میں نقل کر کے اُن کی لغویّت واضح کی گئی ہے۔ اہل کتاب جو بنو اسماعیل کو قرآن مجید کی نعمت سے محروم کرنا چاہتے تھے یہ اعتراضات مشرکین مکہ کو بھی سکھایا کرتے تھے اور قریش کے نادان لیڈر اُن کے حسد اور اُن کی چالوں سے بے خبر ہونے کے باعث محض رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کے جوش میں اُن کے بتائے ہوئے شبہات و اعتراضات نقل کرنا شروع کر دیتے تھے۔ یہود کے سکھائے ہوئے متعدد اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ وحی کی مخصوص زبان تو اب تک عبرانی رہی ہے، جس میں وہ تمام صحیفے نازل ہوئے جن کے آسمانی ہونے کا اِقرار قرآن مجید کو بھی ہے تو اَب اللہ تعالیٰ نے اپنی زبان کیوں بدل لی اور یہ نئی وحی عربی میں کیوں نازل ہوئی؟ قرآن مجید نے اس کا جواب یہ دیا کہ ان لوگوں کا یہ اِعتراض محض برائے اِعتراض اور قرآن مجید کی مخالفت کے لیے ایک بہانہ ہے۔ اگر قرآن مجید کسی عجمی زبان میں اترتا تو یہی لوگ یہ اِعتراض اُٹھاتے کہ اس کی آیتوں کی ہماری زبان

۳- فصلت: ۳

۴- الزخرف: ۳

۵- فصلت: ۴۴

میں اچھی طرح وضاحت کیوں نہیں کی گئی، لیکن جب ہم نے قرآن مجید کو عربی زبان میں اُتار کر اُن کے لیے اچھی طرح کھول دیا تو بجائے اِس کے کہ اللہ تعالیٰ کے اِس فضل واِحسان کے شکر گزار ہوتے، دشمنوں کا سکھایا ہوا یہ اِعتراض لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے سابق روایت کے خلاف اپنی یہ وحی عربی زبان میں کیوں اُتاری، گویا اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان اِن نادانوں کے لیے وجہ اِعتراض بن گیا۔ ءَاَعْجَمِیٌّ وَعَرَبِیٌّ والا فقرہ اُن کے اعتراض ہی کا حصہ ہے کہ اس وقت یہ لوگ یہ بات بناتے کہ پیغام عجمی اور مخاطب عربی!! یعنی یہ کیا بے تکا پن ہے کہ جو لوگ اس کتاب کے سب سے پہلے مخاطب ہیں وہ اس کی زبان سے بالکل نابلد ہیں!!

قرآن مجید میں معرَّب؟

قرآن مجید میں مُعَرَّب الفاظ کے وقوع میں ائمہ کا اختلاف ہے۔ زیادہ تر ائمہ جن میں امام شافعی، مفسر ابن جریر، قاضی ابو بکر اور ابن فارس بھی شریک ہیں، ان کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں عربی زبان سے باہر کا کوئی لفظ واقع نہیں ہوا ہے اور وہ اس کی دلیل میں یہ آیات پیش کرتے ہیں:

☆ ﴿ إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا ﴾[۶] (ہم نے اِس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا۔)

☆ ﴿ إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا ﴾[۷] (ہم نے اِس کو عربی قرآن بنا کر اُتارا ہے تاکہ تم سمجھو۔)

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ: "بأن الكلمات اليسيرة بغير العربية لا تخرجه عن كونه عربيًا والقصيدة الفارسية لا تخرج عنها بلفظة فيها عربية."[۸] (تمام قرآن مجید عربی اَلفاظ سے بھرا پڑا ہے اس لیے اس میں معدودے چند غیر زبانوں کے الفاظ کا آجانا اسے عربی کلام ہونے سے خارج نہیں بنا سکتا۔ ایک فارسی قصیدہ جس میں دو ایک عربی لفظ آئے ہوں فارسی ہی کہلائے گا اور ان چند لفظوں کی وجہ سے عربی قصیدہ نہ ہو جائے گا۔)

۶- یوسف: ۲

۷- الزخرف: ۳

۸- عبد الرحمن بن ابو بکر، جلال الدین سیوطی، **الإتقان في علوم القرآن**، ت: محمد ابو الفضل ابراہیم، مصر، الهيئة المصرية العامة للكتاب، ۱۳۹۴ھ - ۱۹۷۴ء، ج۲، ص۱۲۶

☆ ﴿ وَلَوْ جَعَلْنَٰهُ قُرْءَانًا أَعْجَمِيًّا لَّقَالُوا۟ لَوْلَا فُصِّلَتْ ءَايَٰتُهُۥٓ ءَا۬عْجَمِىٌّ وَعَرَبِىٌّ ﴾[۹] (اوراگر ہم اِس قرآن کو عجمی قرآن کی شکل میں اُتارتے تو یہ لوگ یہ اعتراض اُٹھاتے کہ اس کی آیات کی وضاحت کیوں نہیں کی گئی! کلام عجمی اور مخاطب عربی!)

اس سوال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ: بأن المعنى من السياق: " أكلام أعجمي ومخاطب عربي؟" [۱۰] (یہاں سیاقِ کلام سے یہ معنی بنتے ہیں کہ آیا کلام تو عجمی ہے اور اس کا مخاطب عربی ہو؟)

ابوعبیدۃ اس بات کے سختی سے منکر ہیں کہ قرآن مجید میں کوئی مُعَرَّب ہو، چناں چہ ابو منصور جوالیقی نے اُن کے حوالے سے لکھا ہے: "من زعم أن في القرآن لسانًا سوى العربية فقد أعظم على الله القول، واحتج بقوله تعالى: ﴿ إِنَّا جَعَلْنَٰهُ قُرْءَانًا عَرَبِيًّا ﴾" [۱۱] (جس کا خیال ہو کہ قرآن مجید میں عربی کے سوا دوسری زبانوں کے حروف پائے جاتے ہیں، تو بے شک اُس نے اللہ تعالیٰ کے بارے میں نہایت بڑی بات کی ہے، اس لیے کہ قرآن مجید میں ہے کہ ہم نے اس کو قرآن عربی بنایا ہے۔) لیکن ابوعبیدۃ کہتے ہیں: "وروي عن ابن عباس ومجاهد وعكرمة وغيرهم في أحرف كثيرة أنه من غير لسان العرب مثل سجيل والمشكاة واليم والطور وأباريق وغير ذلك." [۱۲] (سیدنا ابن عباس، مجاہد و عکرمہ اور اُن کے علاوہ دوسرے علما سے قرآن مجید کے بہت سے اَلفاظ کے بارے میں منقول ہے کہ اُن کی اصل عربی نہیں، جیسے: سِجِّیْل، مِشْکَاۃ، یَّم، طُوْر اور أباريق وغیرہ۔)

جوالیقی اور اُن کے حوالے سے حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں:

۹- فصلت: ۴۴

۱۰- سیوطی، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۲۶

۱۱- الزخرف: ۳؛ موہوب بن احمد جوالیقی، **كتاب المُعَرَّب من الكلام على حروف المجعم**، ت: ف، عبدالرحیم، دمشق، دارالعلم، ۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء، ص ۹۲؛ ابو الفرج جمال الدین ابن جوزی، **فنون الأفنان في عجائب علوم القرآن**، بیروت، دارالکتاب العربي، ۱۴۲۶ھ- ۲۰۰۵ء، ص ۱۱۵؛ بدر الدین محمد بن عبداللہ زرکشی، **البرهان في علوم القرآن**، ت: محمد ابو الفضل ابراہیم، بیروت، دار المعرفة، ۱۳۹۱ء، ج ۱، ص ۲۸۷

۱۲- جوالیقی، مصدرِ سابق، ص ۹۲؛ ابن جوزی، مصدرِ سابق، ص ۱۱۵

فهؤلاء أعلم بالتأويل من أبي عبيدة، ولكنهم ذهبوا إلى مذهب، وذهب هذا إلى غيره، وكلاهما مصيبٌ إن شاء الله، وذلک أن هذه الحروف بغير لسان العرب في الأصل فقالوا أولئک على الأصل، ثم لفظت به العرب بألسنتها فعربته فصارعربيًّا بتعريبها إيَّاه، فهي عربية في الحال، أعجمية الأصل، فهذاالقول يصدق الفريقين جميعًا.[۱۳]

یہ سارے (سیدنا ابن عباس، مجاہد اور عکرمۃ) ابوعبیدۃ کی بہ نسبت تفسیر قرآن کے زیادہ جاننے والے ہیں، لیکن اُن کا مسلک الگ ہے اور ابوعبیدۃ کا الگ، اور میرے نزدیک اِن شاء اللہ دونوں قول درست ہیں۔ ان دوبظاہر متضاد اَقوال میں تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ دراصل بعض حروف غیر عربی ہیں، پھر آپس میں میل جول ہونے کے بعد یہ اَلفاظ عربی زبان میں دَر آئے اور عربوں نے ان پر تکلم شروع کیا اور انھیں اتنی کثرت سے استعمال کیا کہ یہ عربی بن گئے، جو فی الحال تو عربی کے الفاظ ہیں مگر اصل میں دوسری زبانوں کے ہیں، اس قول سے دونوں آرا کی آپس میں تطبیق ہو سکتی ہے۔

ابوعبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں:

والصواب عندي مذهب فيه تصديق القولين جميعًا وذلک أن هذه الأحرف أصولها أعجمية كما قال الفقهاء ولكنها وقعت للعرب فعربتها بألسنتها وحولتها عن ألفاظ العجم إلى ألفاظها فصارت عربية، ثم نزل القرآن وقد اختلطت هذه الحروف بكلام العرب، فمن قال:إنها عربية فهو صادقٌ، ومَن قال: عجميةٌ فصادقٌ ومالَ إلى هذا القول الجواليقي وابن الجوزي وآخرون.[۱۴]

میرے نزدیک وہ رائے درست ہے جس میں دونوں اقوال کی تصدیق ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ علما کے حسبِ بیان، اِن اَلفاظ کی اصل عجمی زبانیں ہیں مگر بات یہ ہوئی کہ اہلِ عرب کو اِن کلمات کے استعمال کی ضرورت پڑی تو انھوں نے ان کلمات کو معرَّب بنا کر اپنی زبان سے ادا کرنے کے قابل بنایا، پھر عجمی اَلفاظ کی صورت سے ان کی صورت بھی بدل کر انھیں اپنی زبان کے اَلفاظ سے مشابہ بنالیا اور اسی طرح یہ کلمات عربی زبان کے جز ہو گئے، چناں چہ جس وقت قرآن مجید کا نزول ہوا ہے اُس وقت یہ اَلفاظ عربی کلام میں ایسے مل جل گئے تھے کہ ان کا امتیاز کرنا مشکل تھا، لہٰذا اِس لحاظ سے جو لوگ ان کو عربی زبان میں شامل بتاتے ہیں وہ بھی اور جو لوگ ان کلمات کو عجمی

۱۳- جوالیقی، مصدرِ سابق، ص ۹۲؛ ابن جوزی، مصدرِ سابق، ص ۱۱۵

۱۴- زرکشی، مصدرِ سابق،، ج ۱، ص ۲۹، نوع ۱۷؛ جلال الدین عبدالرحمن سیوطی، **الإتقان في علوم القرآن**، مصر، مطبعة المصطفى البابي الحلبي، ۱۳۹۸ھ- ۱۹۷۸ء، ج ۱، ص ۱۷۹-۱۸۰، نوع ۳۸؛ محمد مرتضیٰ زبیدی، **تاج العروس**، بیروت، منشورات مكتبة الحياة، بدون تاریخ، ج ۱، ص ۹۰، مقدمہ

قرار دیتے ہیں وہ بھی، دونوں بجائے خود سچے ہیں۔ جوالیقی، ابن جوزی اور بہت سے دیگر علما بھی اس قول کی طرف مائل ہیں۔

اس فن میں لکھنے والے

جوالیقی:

موہوب بن احمد بن محمد بن خضر بن حسن بن منصور جوالیقی۔ ۴۶۶ھ-۱۰۷۳ء کو بغداد میں پیدا ہوئے۔ ادب ولغت کے بہت بڑے عالم تھے۔ مقتفی باللہ عباسی کے امام تھے۔ مقتفی باللہ نے اُن سے کچھ کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ بوریاں بنانے اور بیچنے والے کو فارسی میں گووال کہتے ہیں، جسے عربی میں جُوَالِقْ کی شکل دے دی گئی اور آپ اسی کاروبار کی نسبت سے مشہور ہوئے۔ آپ مدرسہ نظامیہ میں اپنے استاد اور علم الألسنة کے شعبے کے صدر، تبریزی کے دوسرے جانشین ہوئے۔ پکے سُنّی حنبلی تھے اور انھیں علی بن زید کی جگہ، جو حد سے زیادہ بدنام شیعہ تھا اور جس سے زبردستی استعفا دلوایا گیا تھا، مقرر کیا گیا۔ جوالیقی نہایت فرض شناس معلم تھے اور سوالات کے جواب بہت احتیاط کے ساتھ سوچ سمجھ کر دیتے تھے۔ اُن کی خوش نویسی کی بہت تعریف کی جاتی تھی۔ اُن کی تصانیف اِس بِنا پر تبریزی کی تصانیف کی ہم پلہ سمجھی جانے کی مستحق ہیں کہ انھوں نے عربی زبان کا صحافتی درجہ اس پستی سے، جس میں وہ سلجوقیوں کے زمانے میں جا پڑی تھی، نکال کر بلند کیا۔ آپ نے ۵۴۰ھ- ۱۱۴۵ء کو بغداد میں وفات پائی۔[۱۵]

ہمارے اس موضوع سے متعلق اُن کی تصنیف کا نام **كِتَابُ الْمُعَرَّبِ مِنَ الْكَلَامِ الْعَجَمِيِّ عَلَى حُرُوْفِ الْمُعْجَمِ** ہے، جو ڈاکٹر، عبدالرحیم کی تحقیق کے ساتھ دار القلم دمشق نے ۱۴۱۰ھ-۱۹۹۰ء کو پہلی

۱۵- شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ حوی روحی بغدادی، **معجم الأدباء**، بیروت، دار إحياء التراث العربي، ۱۳۹۹ھ- ۱۹۷۹، ج ۱۹، ص ۲۰۵؛ ابو العباس شمس الدین احمد بن ابی بکر خلکان، **وفيات الأعيان و أنباءأنباء الزمان**، ت: ڈاکٹر احسان عباس، قم۔ ایران، منشورات الرضی، ۱۳۴۶، ج ۵، ص ۳۴۲؛ ابن عماد شہاب الدین ابو الفلاح عبدالحی بن احمد بن محمد عکری حنبلی دمشقی، **شذرات الذهب في أخبار من ذهب**، بیروت، دار ابن کثیر، ۱۴۰۶ھ- ۱۹۸۶ء، ج ۴، ص ۱۲۷

بار شائع کی ہے۔ کتاب میں اُن ۷۳۲ عجمی الفاظ سے بحث کی گئی ہے، جنھیں عربی زبان نے قبول کر کے عربی بنا دیا، یہ کتاب ۶۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

ابن جوزی

عبد الرحمن بن علی بن محمد الجوزی ابو الفرج (۵۰۸ء-۵۹۷ء / ۱۱۱۴ء-۱۲۰۱ء) تاریخ و حدیث کے جلیل القدر عالم اور کثیر التصانیف مصنف ہیں، ولادت اور وفات بغداد میں ہوئی۔[۱۶] حافظ صاحب موصوف بہت تیز فہم شخص تھے، چناں چہ جب اُن کے ایک استاذ ابن زَاغونی (وفات: ۵۲۷ھ) نے وفات پائی تو انھوں نے استاذ کی مسندِ وعظ و تذکیر پر متمکن ہونا چاہا، لیکن نو عمری کی وجہ سے یہ شرف انھیں حاصل نہ ہو سکا، مگر اِس کے بعد جب لوگوں نے اُن کے وعظ کا نمونہ دیکھا تو انھیں جامع المنصور میں وعظ کرنے کی اجازت مل گئی۔ اب ابن جوزی نے اپنی تحصیل علم کی سعی کو پہلے سے زیادہ تیز کر دیا، چوں کہ اُن کے نزدیک سب سے اچھی نافلہ عبادت تحصیلِ علم تھی، اس لیئے وہ کسی طرف چنداں مائل نہ تھے، بلکہ کھانے پینے اور خصوصاً ایسی غذاؤں کا اِہتمام کرتے تھے جن سے قوتِ حافظہ قوی ہو اور لباس پر بھی خاص توجہ دیتے تھے۔[۱۷] حافظ ابن جوزی نے اپنی کتاب **فنون الأفنان** میں کہا ہے کہ انھوں نے یہ علم اپنے استاد جوالیقی سے حاصل کیا ہے، چناں چہ ذِکر اللغات في القرآن کے عنوان کے تحت معرب سے بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے: ”فهذه جملة ماقرأنا على شيخنا أبي منصور وهوكل ماذكره في كتابه **المعرب**.“[۱۸] (یہ سارے کے سارے وہ حروف ہیں جو ہم نے اپنے استاذ ابو منصور سے سنے ہیں اوران سب کا ذِکر انھوں نے اپنی کتاب **اَلْمُعَرَّبْ** میں بھی کیا ہے۔)

حافظ ذہبی نے موفق عبد اللطیف کے حوالے سے لکھا ہے:

قرأت بخط محمد بن عبد الجليل الموقاني: أن ابن الجوزي شرب البلاذر، فسقطت لحيته، فكانت قصيرة جدا، وكان يخضبها بالسواد إلى أن مات. قال: وكان كثير الغلط فيما يصنفه، فإنه كان

۱۶- خیر الدین زرکلی، **الأعلام**، بیروت، دار العلم للملايين، ط۱۵، ۲۰۰۲ء، ج۳، ص۳۱۶

۱۷- شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان ذہبی، **سیر أعلام النبلاء**، بیروت، مؤسسة الرسالة، ۱۴۱۰ھ- ۱۹۹۰ء، ج ۲۱، ص۳۶۵

۱۸- ابن جوزی، **فنون الأفنان**، ص۱۱۶

يفرغ من الكتاب ولا يعتبره. قلت: هكذا هو له أوهام وألوان من ترك المراجعة، وأخذ العلم من صحف، وصنف شيئا لو عاش عمرا ثانيا، لما لحق أن يحرره ويتقنه.[۱۹]

میں نے محمد بن عبدالجلیل کے خط میں لکھا ہوا پڑھا ہے کہ ابن جوزی نے بلاذر[۲۰] پی لیا تھا، جس کے باعث اُن کی داڑھی کے بال گر گئے اور اُن کی داڑھی بہت چھوٹی رہ گئی، جسے آپ اپنی وفات تک کالے خضاب سے رنگ لیا کرتے تھے۔ یہ بھی کہا کہ آپ اپنی کتابوں میں بہ کثرت غلطیاں کرتے ہیں، اس لیے کہ آپ جب کتاب سے فارغ ہو جاتے تو اُس پر نظر ثانی کرنے کی آپ کو عادت نہیں تھی۔ میں (حافظ ذہبی) کہتا ہوں کہ اُن کے کئی اَوہام اور کئی رنگ ہیں، جس کی وجہ، علما اور کتابوں کی طرف عدم مراجَعت ہے اور اسی طرح صرف کتابوں سے حصول علم بھی اس کا سبب ہے کہ اِنسان خطا کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو مزید عمر ملتی اور ان کتابوں پر نظر ثانی کر لیتے تو ان میں سے بہت سی چیزوں کو وہ دوبارہ نہ لکھتے۔

بدرالدین زرکشی

محمد بن بہادر بن عبداللہ زرکشی، ابوعبداللہ، بدرالدین اُن بڑے پختہ کار اور تجربہ کار علما میں سے ہیں جو آٹھویں صدی میں مصر میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اربابِ اجتہاد میں سے تھے، اصولِ دین، فقہ، تفسیر اور حدیث کے ماہر عالم تھے۔ ۷۴۵ھ-۱۳۴۴ کو قاہرہ میں، جہاں مدارس و مکاتب کے کثرت تھی، پیدا ہوئے۔ ترکی الاصل تھے۔ بچپن ہی میں حصول علم میں لگ گئے اور بہت جلد ہی شافعی مسلک پر عبور حاصل کیا۔ امام نووی کی کتاب **المنہاج** کو اَزبر کیا اور اسی نسبت سے منہاجی کہلائے۔ دیارِ مصر میں رئیس الشافعیہ جمال الدین اِسنوی تھے جو مدرسہ کاملیہ میں نے بدل امامِ حدیث تھے۔ زرکشی نے اُن کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیے اور بہت جلد اُن کے

۱۹- ذہبی، مصدرِ سابق، ج ۲۱، ص ۳۷۸

۲۰- بلاذُر فارسی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں حَبُّ الفَہم اور حَبُّ القَلب، جب کہ انگریزی میں Marking Nuts کہلاتا ہے۔ یہ ایک پہاڑی درخت کا پھل ہے جو بیر سے چھوٹا ہوتا ہے، اس کے سر پر ایک ٹوپی سی لگی ہوتی ہے جس کو کلاہِ بلادر کہتے ہیں۔ بلادر کو دبانے سے شہد کی مانند سیاہ رنگ کی گاڑھی رطوبت نکلتی ہے جس کو عسلِ بلادر کہتے ہیں۔ یہ پھل کسی قدر گول اور چپٹا سا ہوتا ہے اس لیے اس کو عربی میں حَبُّ القلب کہتے ہیں۔ یہ محلل اور مقوی اعصاب ہے اور نامردی کے علاج کے لیے کئی دوائیوں میں استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس کا استعمال نقصان سے خالی نہیں۔ بعض مزاجوں میں اس سے گرمی زیادہ ہو جاتی ہے۔ (حکیم مظفر حسین اعوان، **کتاب المفردات خواص الادویہ**، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۸-۱۲۹)

صفِ اول کے تلامذہ میں اُن کا شمار ہونے لگا۔ حلب میں شیخ شہاب الدین ازرعی سے فقہ اوراصول کا علم حاصل کیا پھر دمشق جاکر ابن کثیر سے علم حدیث پڑھا، جس کے بعد آپ قاہرہ واپس لوٹ آئے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"وكان منقطعا في منزله لا يتردد إلى أحد إلا إلى سوق الكتب وإذا حضره لا يشتري شيئا وإنما يطالع في حانوت الكتبي طول نهاره ومعه ظهور أوراق يعلق فيها ما يعجبه ثم يرجع فينقله إلى تصانيفه."[۲۱] (لوگوں سے الگ اپنے گھر میں رہا کرتے تھے، کسی سے ملتے ملاتے نہ تھے۔ باہر نکلتے تو کتابوں کی دوکانوں کا رُخ کرتے، وہاں بھی کچھ خرید وفروخت نہ کرتے بلکہ کتبی کی دوکان پر بیٹھ کر سارا سارا دن مطالَعہ کرتے، اور جو لطیفہ اور نکتہ اُن کے سامنے آتا، اُسے اوراق میں لکھ لیتے اور جب گھر لوٹ آتے تو اُن کو اپنی تصانیف میں شامل کر لیتے۔)

آپ اپنی کتابیں خود لکھتے، کسی وراق سے نہ لکھواتے۔ چوں کہ نہایت بدخط تھے اس لیے بعد میں اُن کی کتابوں کو نقل کرنے والوں کو سخت دقت اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ رجب ۷۹۴ھ-۱۳۹۲ء کو مصر میں وفات پائی۔[۲۲] انھوں نے اس موضوع پر اگرچہ کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن اپنی کتاب **البرهان** کی جلد اول، نوع:۱۷ میں معرفة ما فيه من غير لغة العرب کے عنوان کے تحت سیر حاصل بحث کی ہے اور قرآنی معرب کی مثالیں پیش کی ہیں۔

تاج الدین سبکی

عبدالوہاب بن علی بن عبدالکافی، ابونصر، ۷۲۷ھ-۱۳۲۷ء کو قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد کے ساتھ دمشق منتقل ہوئے۔ اَلسُّبْکی کی طرف منسوب ہو کر سبکي کہلائے جو مَمْفِسْ کے علاقے مَنُوف کے ضلع اَلْمَنُوفيّة میں ایک جگہ کا نام ہے۔ شافعی علما کے خاندان اَلسُّبْكِي سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاج الدین دمشق اور قاہرہ میں استاذ، مفتی، قاضی، حاکم اور جامع اموی کے خطیب رہے ہیں۔ ۷۶۹ھ کو ۸۰ دن کے لیے جیل کی ہوا کھانی پڑی

۲۱- ابن حجر عسقلانی، **الدرر الكامنة في أعيان المائة الثامنة**، بیروت، دار الجیل، ۱۴۱۴ھ-۱۹۹۳ء، ج۳، ص۳۹۸

۲۲- عسقلانی، نفسِ مصدر، ج ۳، ص ۳۹۷ عکری، **شذرات الذهب في أخبار من ذهب**، ج ۶، ص ۳۳۵؛ ذہبی، **سير أعلام النبلاء**، ج۶، ص ۶۰-۶۱

اور پھر اپنے منصب پر بحال ہوئے۔ ۷۷۱ھ-۱۳۷۰ء کو بہ عارضۂ طاعون وفات پائی۔[۲۳] ہمارے اس موضوع سے متعلق اُن کی کتاب کا نام مُعِيْدُ النِّعَمْ وَمُبِيْدُالنِّقَمْ ہے، جو ۱۴۷ صفحات پر مشتمل ایک چھوٹی سی کتاب ہے، جس میں اُن کا موضوع قرآنی معرب نہیں ، بلکہ بنیادی پر یہ کتاب سیاسی، سماجی اور عسکری معرب مصطلحات کی ہے۔ اُن کی یہ کتاب ڈاکٹر صلاح الدین ہواری کی تحقیق کے ساتھ المكتبة العصرية بیروت سے شائع ہوگئی ہے۔

جلال الدین سیوطی

عبد الرحمن ابن ابی بکر بن محمد جلال الدین سیوطی (۸۴۹ء-۹۱۱ء/ ۱۴۴۵ء-۱۵۰۵ء، نام ور مصنف ہیں جن کی تقریباً چھے سو کے قریب تصانیف ہیں۔ قاہرہ میں پیدا ہوئے آپ کی تصانیف بہت سے علوم و فنون کا احاطہ کرتی ہیں۔[۲۴]

ہمارے اس موضوع سے متعلق انھوں نے **الإتقان في علوم القرآن** میں نوع:۳۸ میں فيما وقع فيه مِن غيرلغة العرب اورنوع: ۶۹ میں فيماوقع في القرآن مِن الأسماء والكُنٰى والألقاب کے عنوان کے تحت سیر حاصل بحث کی ہے اور قرآنی معرب کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ ان جزوی مباحث کے علاوہ اس موضوع سے متعلق اُن کی ایک نہایت نفیس کتاب بھی ہے، جو عام اور متداول ہے جس کا نام اَلْمُهذّبْ لِمَا فِي الْقُرْآنِ مِنَ الْمُعَرَّبْ ہے، جس میں ۱۲۵ مُعَرَّبْ الفاظ سے بحث کی گئی ہے۔

خفاجی

احمد بن محمد بن عمر، شہاب الدین خفاجی مصری، خفاجہ قبیلہ کی نسبت سے خفاجی کہلائے۔ قاہرہ کے نواح میں ۹۷۷ھ-۱۵۶۹ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے ماموں ابو بکر شَنَوائی سے حاصل کی اور اُن سے فقہ حنفی اور فقہ شافعی پڑھی۔ آپ روم ایلی کے عہدۂ قضا پر بھی فائز رہے ہیں، جس کے بعد ترقی کر کے سلطان مراد کے زمانے میں اُسکوب کے قاضی ہوگئے۔ معزول ہو جانے کے بعد شام اور حلب کے سفر کیے۔ مصر واپس آکر پھر قاضی

۲۳- عسقلانی، مصدرِ سابق، ج ۲، ص ۴۲۵؛ ذہبی، مصدرِ سابق، ج ۴، ص ۱۸۵

۲۴- زرکلی، الأعلام، ج ۳، ص ۳۰۱

بنادیے گئے اور مصر ہی میں ۱۰۶۹ھ - ۱۶۵۹ء کو داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[۲۵] ہمارے اس موضوع سے متعلق اُن کی نہایت باوقار اور تحقیقی کتاب کا نام **شَفَاء الغَلِيْل فيما في كلام العربِ مِنَ الدَّخِيل** ہے، جو جوالیقی کی کتاب کے بعد کا درجہ رکھتی ہے اور ڈاکٹر محمد کشاش کی تحقیق کے ساتھ دار الکتب العلمیة بیروت سے ۴۱۶ صفحات میں شائع ہو گئی ہے۔

حمزہ فتح اللہ مصری

اسکندریہ میں ۱۲۶۶ھ - ۱۸۴۹ء کو پیدا ہوئے، قاہرہ منتقل ہوئے۔ ازہر میں تعلیم حاصل کی، وہاں سے تیونس چلے گئے اور وہاں **الرائدالتونسي** کے نام سے ایک جریدہ جاری کیا۔ آٹھ سال وہاں اقامت پذیر رہے، وہاں سے اسکندریہ تشریف لے گئے اور تقریباً تیس سال تک وزارتِ معارف سے منسلک رہے۔ ۱۳۳۶ھ-۱۹۱۸ء کو وفات پائی۔[۲۶] اس فن سے متعلق اُن کی کتاب کا نام **الأصلُ والبيان في مُعَرَّبِ القرآن** ہے۔ مصنفِ علام نے حافظ سیوطی کی کتاب کو محض مکرر کیا ہے، اور اس میں کوئی مزید اضافہ نہیں کر سکے۔[۲۷]

ڈاکٹر محمد السید علی بلاسی

الأصل و البيان ۳۸۰ صفحات پر مشتمل نہایت عمدہ کتاب ہے، جس میں ۱۶۱ قرآنی معرب اَلفاظ سے بحث کی گئی ہے۔ اسے ۱۳۶۹ھ-۲۰۰۱ء کو جمعية الدعوة الإسلامية لیبیا نے شائع کیا ہے۔

قرآن کریم میں غیر عربی الفاظ کے حوالے سے عربی زبان کا دامن اگرچہ پُر ثروت ہے، لیکن اردو زبان میں اس طرح کی قابلِ ذکر نگارشارت موجود نہیں ہیں، اس لیے مناسب محسوس ہوا کہ اس موضوع پر اہلِ علم کی تحقیقات کی روشنی میں قرآنِ کریم میں واقع ہونے والے معرب الفاظ کے بارے میں خامہ فرسائی کی جائے۔ اس لیے اب ہم یہاں قرآنِ کریم میں واقع ہونے والے معرب الفاظ کو ترتیب کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔

۲۵- محمد امین بن فضل اللہ حموی، **خلاصة الأثر في أعيان القرن الحادي عشر**، مصر، ۱۲۸۴ھ، ج۱، ص۳۳۱؛ ذہبی، مصدرِ سابق، ج۱، ص ۲۳۸

۲۶- ذہبی، مصدرِ سابق، ج۲، ص۲۸۰

۲۷- ڈاکٹر محمد سید علی بلاسی، **المعرب في القرآن الكريم**، لیبیا، جمیعة الدعوة الإسلامية، ۱۳۶۹ھ - ۲۰۰۱ء، ص۱۲

الآخرة

قرآن مجید میں ہے: ﴿ مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ ﴾ [۲۸] (ہم نے تو یہ بات پچھلے مذہب میں نہیں سنی۔) امام بدرالدین زرکشی لکھتے ہیں: "(الملة الآخرة) أي الأولى بالقبطية والقبط يسمون الآخرة الأولى والأولى الآخرةالْمِلَّة."[۲۹] (قبطیہ میں الملة الآخرة کے معنی الملة الأولى (پچھلا مذہب) کے ہیں۔)

آدم علیہ السلام

امام ابو منصور جوالیقی اور ابن جوزی نے تصریح کی ہے کہ انبیا علیہم السلام کے تمام اسما عجمی ہیں، البتہ چار نام: آدم، صالح، شعیب اور محمد علیہم الصلوات والسلام اس سے مستثنیٰ ہیں۔[۳۰]

امام زمخشری لکھتے ہیں: "واشتقاقهم «آدم» من الأدمة، ومن أديم الأرض، نحو اشتقاقهم «يعقوب» من العقب، و «إدريس» من الدرس، و «إبليس» من الإبلاس. وما آدم إلا اسم أعجمي: وأقرب أمره أن يكون على فاعل، كآزر، وعازر، وعابر وشالخ. وفالغ، وأشباه ذلك.[۳۱] (لوگوں کا آدم کو أدمة یا أديم الأرض سے مشتق بتانا ایسا ہے جیسا کہ یعقوب کو عَقِب سے، إدريس کو دَرْسٌ سے اور إبليس کو إبلاس سے مشتق بتانا، حالاں کہ آدم قطعی عجمی نام ہے جس کا "فاعل" کے وزن پر ہونا زیادہ قرین قیاس ہے، جیسے کہ آزر، عازر، عابر، شالخ اور فالغ[۳۲] وغیرہ۔) امام بیضاوی

۲۸- ص: ۷

۲۹- زرکشی، البرهان، ج ۱، ص ۲۸۸؛ سیوطی، الإتقان، ج ۱، ص ۱۸۰، ڈاکٹر محمد التونجی، المعرب والدخيل في اللغة العربية و آدابها، بیروت، دار المعرفة، ۱۴۲۶ھ - ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۱

۳۰- جوالیقی، المعرب، ص ۱۰۲؛ ابن جوزی، فنون الأفنان، ص ۱۱۵

۳۱- جار اللہ محمود بن عمر زمخشری، الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل وعيون الأقاويل في وجوه التأويل، کراچی، کتب خانہ مظہری، بدون تاریخ، ج ۱، ص ۱۲۵

وزن پر ہونا زیادہ قرین قیاس ہے، جیسے کہ آزر، عازر، عابر، شالخ اور فالغ[۳۲] وغیرہ۔) امام بیضاوی لکھتے ہیں:

"وآدَمَ اسم أعجمي كآزر وشالح، واشتقاقه من الأُدْمة أو الأَدْمة بالفتح بمعنى الأسوة، أو من أديم الأرض ... أو من الأدم أو الأدمة بمعنى الألفة، تعسف كاشتقاق إدريس من الدرس، ويعقوب من العقب، وإبليس من الإبلاس. "[۳۳] (آدم عجمی نام ہے، جیسے آزر اور شالخ، اسے أَدْمَةٌ بمعنی اُسوہ ونمونہ یا أديم الأرض [روے زمین سے لینے کی نسبت سے] یا أدم /أدمة بمعنی اُلفت ومحبت سے ماخوذ ماننا اس طرح ہے جیسا کہ اِدریس کو درس سے، یعقوب کو عقب سے اور ابلیس کو اِبلاس سے ماننا تَعَسُّفْ[۳۴] ہے۔"

۳۲- خیال رہے کہ ادریس اور ابلیس کے غیر منصرف ہونے کی جو دلیل زمخشری نے پیش کی ہے، وہ یہاں معتبر نہیں، کیوں کہ ادریس و ابلیس کو اگر عجمی نہ مانا جائے تو ان کے غیر منصرف ہونے کے لیے صرف ایک سبب یعنی عَلَمِیَّتْ باقی رہ جاتا ہے جو غیر منصرف ہونے کے لیے کافی نہیں، اس لیے ان کا غیر منصرف ہونا اُن کے عجمی ہونے کی دلیل ہے، لیکن آدم میں ایسا نہیں، کیوں کہ اگر اس کو عجمی نہ مانا جائے تو اس کے غیر منصرف ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس لیے کہ اس کے غیر منصرف ہونے کے لیے اس میں عَلَمِیَّتْ کے علاوہ وزنِ فعل موجود ہے، اس صورت میں آدم دراصل أَ أَدَمُ تھا جس میں دو ہمزہ ہیں، پھر چوں کہ ہمزہ ثانیہ ساکن ہے، جس کا ماقبل مفتوح ہے، اس لیے اسے الف سے تبدیل کر دیا گیا، ہاں آدم کی جمع أَوَادِم اور تصغیر أُوَيْدَمْ کے ساتھ آنا زمخشری کے خیال کی تائید کرتا ہے، کیوں کہ اگر آدم، أَ أَدَمُ ہوتا تو اس کی جمع (أَ أَدَمُ) اور تصغیر (أُوَيْدَم) بھی ہمزہ کے ساتھ ہوتی۔ (دیکھیے: محمد عبد الرشید نعمانی، **لغات القرآن مع فهرست الفاظ**، لاہور، مکتبہ حسن سہیل، ج ۱، ص ۵۷

۳۳- ناصر الدین ابو الخیر عبد اللہ بن عمر محمد شیرازی، **أنوار التنزيل و أسرار التاويل** المعروف به **تفسير البيضاوي**، بیروت، دار إحيا التراث العربي، ۱۴۱۸ھ- ۱۹۹۸ء، ج ۱، ص ۶۹

۳۴- تَعَسَّفَ فِي القَولِ: بے راہ روی کرنا، ایسے معنی پر حمل کرنا جس پر دلالت ظاہر نہ ہو۔

آزَر

یہ اسم عجمی ہے۔[۳۵] "فَاعل" کے وزن پر عابر، فالغ اور شالخ کی طرح عبرانی لفظ ہے اور عجمیت وعلمیت کے سبب غیر منصرف ہے، بہ قولِ زمخشری: "والأقرب أن يكون وزن آزَر فاعَل مثل:تارَح وعابَر وعازَر وشالَخ وفالَغ وما أشبهها من أسمائهم."[۳۶] (زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ آزر "فاعل" کے وزن پر ہو، جیسے عابر، عازر، شالخ، فالغ اور اس طرح کے دیگر اسما۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "سفر تکوین ۱۱/۲۶ میں اس کا نام تیرح ہے، جس میں سے ح کو حذف کر کے ثَرَّا پڑھا گیا اور غیجر [Geiger] کے حوالے سے لکھا ہے کہ ثَرَّا میں قلبِ مکانی ہو کر پہلے آثر اور پھر آزر بنا۔"[۳۷]

چوں کہ تورات اور تاریخ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ اور قرآنِ عزیز میں آزر آیا ہے، اس لیے علما اور مفسرین نے اس مسئلے کی تحقیق میں دو رائیں قائم کیں۔

۱- ایسی صورت اختیار کی جائے کہ دونوں ناموں کے درمیان مطابقت ہو جائے اور یہ اختلاف جاتا رہے۔

۲- تحقیق کے بعد فیصلہ کن بات کی جائے کہ ان دونوں میں کون سی بات صحیح اور کون سی غلط ہے، یا دونوں باتیں صحیح ہیں مگر یہ دو جدا جدا ہستیوں کے نام ہیں۔

پہلے خیال کے علما کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں اور تارَخ، علم اسمی (اسمی نام) ہے، جب کہ آزر، عَلَم وصفی [وصفی نام] ہے: "وقيل:العَلَم تارَخ وآزر وصفٌ، معناه: الشيخ أو المعوج."[۳۸] ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ آزر عبرانی زبان میں محب صنم کو کہتے ہیں اور تارخ میں چوں کہ بت تراشی اور بت پرستی دونوں وصف موجود تھے، اس لیے آزر کے لقب سے مشہور ہوا اور بعض علما کا

---

۳۵ - جوالیقی، المُعَرَّب، ص۱۰۸

۳۶- زمخشری، الکشاف، ج۲، ص۳۹

۳۷ - جوالیقی، مصدرِ سابق، ص۱۳۵

۳۸- بیضاوی، تفسير البيضاوي، ج۱، ص۳۱۷

خیال ہے کہ آزر کے معنی أعرج یعنی کم فہم، بے وقوف اور پیر فرتوت کے ہیں: "كلمة ذم في بعض اللغات أي:يا أعرج، قال السهيلي:وفي **التكملة**:ياأعرج، أوكأنه قال وإذقال إبراهيم لأبيه الخاطئ، وفي **التكملة**:يا مخطئ، يا خَرِف، وقيل معناه:ياشيخ، أوهي كلمة زجرٍ ونهي عن الباطل."[۳۹] چوں کہ تاریخ میں یہ سب باتیں موجود تھیں اس لیے اس وصف سے یاد کیا گیا۔ قرآنِ عزیز نے اس کے مشہور وصفی عَلَم کو بیان کیا۔ دوسرے خیال کے علما کی تحقیق یہ ہے کہ آزر اس بت کا نام ہے جس کا تاریخ پجاری تھا جیسا کہ مجاہد کا خیال ہے:"إن آزراسم صنم، وكان اسم أبيه تارخ."[۴۰] ابن جریر لکھتے ہیں:"فأما الذي ذُكر أنَّ آزر اسم صنم، وإنما نصبه بمعنى:أتتخذ آزر أصنامًا آلهة، فقولٌ من الصواب من جهة العربية بعيدٌ، وذلک أن العرب لاتنصب اسما بفعلٍ بعد حرف الاستفهام، لاتقول:أخاک أكلمت، وهي تريد:أكلمت أخاک. "[۴۱] (عربیت کے لحاظ سے یہ قطعاً درست نہیں، بلکہ صحت سے بہت بعید ہے، اس لیے کہ عرب، حرفِ استفہام کے بعد کسی اسم کو فعل سے منصوب نہیں کرتے، وہ "أخاک أكلمت" نہیں کہیں گے بلکہ "أكلمت أخاک "کہیں گے۔) مزید ارشاد فرماتے ہیں:"فأولى القولين بالصواب منهما عندي قولُ من قال: هو اسم أبيه، لأن اللهتعالى ذكره أخبر أنه أبوه، وهوالقول المحفوظ من قولي أهل العلم دون القول الآخرالذي زعم قائله أنه نعتٌ." [۴۲] (میرے نزدیک اُن لوگوں کی بات زیادہ درست معلوم ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ آزر اُن کے باپ کا نام تھا، اس لیے کہ اللہ تعالی آزر کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے باپ کہتے ہیں۔ اہلِ علم کا یہی قول محفوظ ہے، اور وہ قول غیر محفوظ ہے جس

۳۹- زبیدی، **تاج العروس**، مادہ: أزر

۴۰- ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب ماوردی بصری، **النكت والعيون السمى بتفسير الماوردي**، تحقیق: سید بن عبدالمقصود ابن عبدالرحیم، بیروت، دارالكتب العلمية، بدون تاریخ، ج۲، ص۱۳۴؛ ابن منظور افریقی، **لسان العرب**، حرف الراء، فصل الألف

۴۱- ابوجعفر محمد بن جریر طبری، **تفسير الطبري**، بیروت، دارالكتب العلمية، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء، ج۵، ص۲۴۰

۴۲- طبری، مصدرِ سابق، ج۵، ص۲۴۰

میں کہا گیا ہے کہ یہ وصفی نام تھا۔) مولانا حِفظ الرحمن سیوہاروی[۴۳] لکھتے ہیں کہ: ہمارے نزدیک یہ تمام تکلفات بارِدہ ہیں، اس لیے کہ "قرآنِ عزیز نے جب صراحت کے ساتھ آزر کو اَبِ ابراہیم (علیہ السلام) کہا ہے تو پھر محض علماے انساب اور بائبل کے تخمینی قیاسات سے متاثر ہو کر قرآنِ عزیز کے یقینی تعبیر کو مجاز کہنے یا اس سے آگے بڑھ کر خواہ مخواہ قرآنِ عزیز میں نحوی مقدرات ماننے پر کون سی شرعی اور حقیقی ضرورت مجبور کرتی ہے؟"[۴۴] مولانا عبدالماجد دریابادی[۴۵] فرماتے ہیں کہ:

"آزر" عربی، توریت میں اس نام کا املا "تارح" ملتا ہے اور انگریزی میں تیرا[Terah] اور تالمود میں "ترائ"۔ جو لوگ علم اللسان کے مبادی سے بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی نام مختلف زبانوں میں جا جا کر کیسے کیسے عجیب تلفظ اختیار کر لیتا ہے، فلسطین کے قدیم مسیحی مؤرخ یوسیبیس[Eusebius][۴۶] کے ہاں آشریا ہاتھر آیا ہے، ان دونوں تلفظوں کی مشابہت و مماثلت آزر سے بالکل ظاہر ہے اور آزر و زارہ بھی اگر ایک ہی مادہ سے مشتق ہوں تو کچھ بعید نہیں۔[۴۷]

۴۳- حفظ الرحمن بن مولوی شمس الدین صدیقی ۱۹۰۱ء کو سیوہارہ، ضلع بجنور (ہند) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سیوہارہ کے مدرسہ، فیضِ عام، میں حاصل کی اس کے بعد مشہور علمی درس گاہ دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، جہاں آپ کو علامہ انور شاہ محدث کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمن اور میاں اصغر حسین جیسے نادرۂ روزگار اساتذہ سے استفادے کا موقع ملا۔ بڑے پائے کے عالم تھے۔ ۲-اگست ۱۹۶۲ کو کینسر کے مرض سے وفات پائی۔ نماز جنازہ قاری محمد طیب نے پڑھائی۔ (**شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا**، ج ۲، ص ۸۷۵)

۴۴- محمد حفظ الرحمن سیوہاری، **قصص القرآن**، لاہور، مکتبہ مدنیہ، بدون تاریخ، ج ۱، ص ۱۵۳

۴۵- عبدالماجد، ۱۸۹۲ء کو قصبہ دریاباد (ہند) میں عبدالقادر کے گھر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ کیننگ کالج لکھنؤ سے گریجویشن کیا۔ ۱۹۱۳ء میں فلسفہ پڑھنے کی خاطر علی گڑھ کالج کا رُخ کیا، لیکن ایم اے کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ۱۹۲۸ء میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی سے استفادہ شروع کیا۔ ۱۹۶۷ء میں فوت ہوئے۔ (**مسلم شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا**، ص ۴۱۵)

۴۶- یوسیبیس قریباً ۲۶۰ء میں پیدا ہوئے اور قریباً ۳۴۰ء میں فوت ہوئے۔ ۳۳۵م میں قیصریہ کا بشپ بنے۔ ۳۲۵ء میں کونسل آف نیقیا، ۳۳۵ میں کونسل آف طائر میں شرکت کی۔ (Ecclesiastica History) تاریخ کلیسیا دس جلدوں میں ان کی مشہور کتاب ہے جو چوتھی صدی عیسوی کے ربع اول تک عیسائیت کی ایک مسلمہ تاریخ ہے۔ (دی آکسفورڈ ڈکشنری آف کرسچین چرچ، ص ۴۸۱)

۴۷- عبدالماجد دریابادی، **تفسیر ماجدی**، لاہور، تاج کمپنی لمیٹڈ، بدون تاریخ، ص ۲۹۷، حاشیہ ۱۱۳

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ اور چچا کا نام آزر تھا، آزر ہی نے ان کی تربیت کی تھی اور انھیں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا، اس لیے قرآن عزیز نے آزر کو اَبِ ابراہیم کہہ کر پکارا جیسا کہ روایت میں ہے: "العَمُّ صِنْوُ أَبیه"، (چچا باپ ہی کی طرح ہے) اور قرآن مجید میں ارشاد ہے کہ: ﴿ نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ ءَابَآئِكَ إِبْرَٰهِـۧمَ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ إِلَٰهًا وَٰحِدًا ﴾[۴۸] یہ بات ظاہر ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سیدنا یعقوب علیہ السلام کے دادا، سیدنا اسماعیل علیہ السلام ان کے تایا اور سیدنا اسحاق علیہ السلام ان کے والد ہیں مگر ان سب پر مجازی طور پر "اَبٌ" کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اسی طرح: ﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ لِأَبِيهِ ءَازَرَ ﴾[۴۹] میں بھی آزر کو مجازاً ابراہیم علیہ السلام کا باپ کہا گیا ہے۔

سید رشید رِضا[۵۰] نے اس اعتراض کا جواب یوں دیا ہے: وأضعف ما قالوه في الجمع بين القولين أن آزر اسم عمه بناء على أن العرب تسمي العم أبا مجازا، وهذه الدعوى لا تصح على إطلاقها، وإنما يصح ذلك حيث توجد قرينة يعلم منها المراد، ولا قرينة هنا ولا في سائر الآيات التي ذكر فيها من غير تسمية.[۵۱] (یہ بات درست ہے کہ عربی زبان میں چچا اور دادا کو بھی مجازاً باپ کہا جاتا ہے، لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ ہر مقام پر أبٌ سے مراد چچا یا دادا ہی لیا جائے، جہاں اس کا استعمال مجازی معنوں میں ہوتا ہے وہاں اس کے لیے کوئی دلیل اور قرینۂ صارفہ موجود ہوتا ہے، جب کہ یہاں کوئی

۴۸- البقرة: ۱۳۳

۴۹- الأنعام: ۷۴

۵۰- محمد رشید رِضا بن علی رضا بن محمد شمس الدین بن محمد بہاء الدین بن منلا علی خلیفہ قلمونی، بغدادی الاصل اور حسینی النسب ہیں۔ طرابلس (شام) میں ۱۲۸۲ھ - ۱۸۶۵ء کو قلمون میں پیدا ہوئے۔ وہاں پلے بڑھے اور وہیں اور طرابلس میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۳۱۵ھ میں مصر جا کر شیخ محمد عبدہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر لیے۔ ہند، حجاز مقدس اور یورپ کے سفر کیے۔ مصر میں رہائش اختیار کی۔ ۱۳۵۴ھ - ۱۹۳۵ء کو سویس سے قاہرہ واپس لوٹتے ہوئے اچانک موٹر میں وفات پائی۔ (ذہبی، **سیر أعلام النبلاء**، ج۶، ص۱۲۶

۵۱- رشید رضا، **تفسیر المنار**، مصر، الهيئة العامة المصرية للكتاب، ج ۷، ص۵۳۶

ٹھوس دلیل، شرعی ضرورت اور قرینۂ صارفہ موجود ہی نہیں، اس لیے آزر، سیدنا ابراہیم علیہ السلام ہی کے والد کا نام تھا۔)

نیز قرآن کریم میں ۱۳ مقامات پر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے والد کا تذکرہ کیا گیا ہے اور کسی بھی مقام پر أبٌ کے برخلاف عَمٌّ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

۱- ﴿ يَـٰٓأَبَتِ ﴾،[۵۲] ۲-﴿ لِأَبِيهِ ﴾،[۵۳] ۳- ﴿ أَبِي ﴾[۵۴] کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآن ان ۱۳ مقامات میں صرف أبٌ کا لفظ استعمال کرتا ہے اور عَمٌّ کا لفظ قصداً چھوڑ دیتا ہے۔ اگر کسی ایک آیت کی بات ہوتی تو اس میں یہ تاویل مناسب سمجھی جاتی، لیکن ان سب آیات میں بغیر کسی شرعی برہان اور قرینۂ صارفہ کے مجازی معنی لینا نہایت مضحکہ خیز ہے۔ نیز **صحیح بخاری** میں[۵۵] اُن کے والد کا نام آزر ہی اختیار کیا گیا ہے، اب اسی صورت میں بغیر کسی قرینے اور ثبوت کے آزر کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا چچا بتا دینا قرینِ انصاف نہیں، کیوں کہ اس دعوے کے ثبوت میں نہ تو کوئی آیت موجود ہے اور نہ کوئی صحیح حدیث یا کوئی صحیح و مستند تاریخی روایت۔

آنٌ / آنيةٌ

حافظ جلال الدین سیوطی اور ڈاکٹر تونجی لکھتے ہیں: "الذي انتهى حَرُّه بلغة البربر."[۵۶] (بربری زبان میں نہایت گرم آگ کو کہا جاتا ہے۔) ﴿ يَطُوفُونَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيمٍ ءَانٍ ﴾[۵۷] (وہ (جہنمی) اس کے

۵۲- مریم: ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵

۵۳- الأنعام: ۷۴؛ التوبة: ۱۱۴؛ مریم: ۴۲؛ الأنبياء: ۵۲؛ الشعراء: ۷۰؛ الصافات: ۸۵؛ الزخرف: ۲۶؛ الممتحنة:

۵۴- الشعراء: ۲۶

۵۵- **صحيح البخاري**، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالى: ﴿ اتَّخَذَ اللهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا ﴾، حدیث: ۳۳۵۰

۵۶- سیوطی، **الإتقان في علوم القرآن**، ج ۱، ص ۱۸۰؛ سیوطی، **المهذب فيما وقع في القرآن من المعرب**، مطبعة فضالة، ص ۲۵، تونجی، **المعرب والدخيل**، ص ۱۹۱

۵۷- الرحمن: ۴۴

اور نہایت گرم پانی کے درمیان چکر کاٹتے ہوں گے۔) ﴿ تُسْقَىٰ مِنْ عَيْنٍ ءَانِيَةٍ ﴾ [۵۸] (انھیں گرمی سے کھولتے ہوئے چشمے سے پلایا جائے گا۔)

أبٌّ

قرآن مجید میں وارد ہے: ﴿ وَفَٰكِهَةً وَأَبًّا ﴾ [۵۹] حافظ سیوطی نے علامہ شیذلہ کی **البرهان** کے حوالے سے لکھا ہے: "الأب: الحشيش بلغة أهل المغرب." [۶۰] (اہل مغرب کی بول چال میں (جانوروں کے کھانے کے) گھاس (اور چارے) کو کہتے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الأب: المرعى وما تعتلفه الأنعام، والكلمة بربرية." [۶۱] (أبٌّ چراگاہ اور جانوروں کے چارے کو کہا جاتا ہے اور یہ بربری زبان کا لفظ ہے۔) "المَرعٰى، وقيل: الأبُّ للبهائم كالفاكهة للناس." (جانوروں کے کھانے کے گھاس اور چارے کو أبٌّ کہتے ہیں۔) [۶۲] یہ کس زبان سے معرب ہے، اس بارے میں امام بدرالدین زرکشی لکھتے ہیں: "الأبُّ: الحشيش، بِلُغَةِ أهل المغرب." [۶۳] (الأبُّ، اہلِ مغرب (بربری) زبان کا لفظ ہے جسے چارے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔) شیخ حمزہ فتح اللہ بھی اسے بربری زبان کا لفظ بتاتے ہیں۔ [۶۴] جب کہ ڈاکٹر عبد النعیم محمد حسنین اسے فارسی کے "بے آب" سے معرب کہتے ہیں، جس کے معنی بلا رونق اور خشک کے ہیں۔ [۶۵] لیکن وہ کون سی

۵۸- الغاشية: ۵

۵۹- عبس: ۳۱

۶۰- سیوطی، **الإتقان**، ج۱، ص۱۸۰؛ **المهذب فيما وقع في القرآن من المعرب**، ص۳۴

۶۱- تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۲

۶۲- ابو عبد احمد بن محمد ہروی، تحقیق احمد فرید مزیدی، **الغريبين في القرآن و الحديث**، بیروت، المكتبة العصريه، ۱۴۱۹ھ - ۱۹۹۹ء، ص۳۷

۶۳- زرکشی، **البرهان**، ج۱، ص۲۸۹

۶۴- حمزہ فتح اللہ، **الأصل والبيان في معرب القرآن**، مصر، مطعبة مصر الحرة، ص۵

۶۵- عبد النعیم محمد حسنین، **قاموس الفارسية**، (فارسی-عربی)، تحت لفظ: ب

گھاس اور کون ساچارہ ہے اور اس کی شکل وصورت کیا ہے؟اس کی تعیین میں اہلِ لغت کے متعدد اقوال ہیں: مجاہد، حسن بصری، قتادۃ اورابن زید کہتے ہیں: الأب للبهائم كالفاكهة لبني آدم.[۶۶] (اِنسانی غذامیں فَوَاكِهْ (میوے) کا جو درجہ ہے چرندوں کی خوراک میں وہی حیثیت اس کی ہے۔) کہتے ہیں کہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جب اس کی تعیین کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: "أيُّ سَماء تُظِلُّني وَاَيُّ أرضٍ تُقِلُّني إن قلتُ في كتاب الله ما لاأعلم."[۶۷] (کون سا آسمان مجھ پہ سایہ فگن ہو گا اور کون سی زمین مجھے اپنے اوپر رہنے دے گی جب کہ میں کتاب اللہ کی تفسیر میں ایسی بات کہہ دوں جس کا مجھے علم نہیں۔)حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں: "اس کی سند میں انقطاع ہے۔"[۶۸] سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی وارد ہے یہ روایت زبان زد ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا کہ: "قد علمنا ما الفاكهة، فما الأب؟ ثم أحسبه، شك الطبري، قال: إن هذا لهو التكلف."[۶۹] (ہم فاکھۃ تو جانتے ہیں مگر یہ اَبٌّ کیا ہے؟ پھر خود فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ اس کی تعیین کا ہم کو مکلف کیا ہے اور نہ حکم دیا ہے۔"حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :"هو إسناد صحيح، وقد رواه غير واحد عن أنس به، وهذا محمول على أنه أراد أن يعرف شكله وجنسه وعينه وإلا فهو

۶۶- عماد الدین ابن کثیر، تفسیر ابن كثير، تحقیق: لجنة من العلماء، ریاض، دارعالم الكتب، ۱۴۲۵ھ - ۲۰۰۴ء، ج۱۴، ص۲۵۲

۶۷- ابو بکر خطیب بغدادی، الجامع لأخلاق الراوي وآداب السامع، تحقیق: عجاج الخطیب، بیروت، مؤسسة الرسالة، ط۳، ۱۴۱۶ھ - ۱۹۹۶ء، ص۳۵۷؛ ابو بکر احمد بن الحسن بن علی بیہقی، شعب الإيمان، بیروت، دارالكتب العلميه، ۱۴۱۰ھ -۱۹۹۰ء، ج۲، ص۴۲۴؛ ابو عبداللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی، الجامع لأحكام القرآن المعروف به تفسير القرطبي، بیروت، دارالكتاب العربي، ۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۷ء، ج۱، ص۲۹، ۲۹:۱، ج۲۰، ص۱۹۳؛ ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ج۱۲، ص۲۵۳؛ الوسی، تفسیر روح المعاني في تفسير القرآن الكليم و السبع المثاني، بیروت، مؤسسة الرسالة، ۱۴۳۱ھ -۲۰۱۰ء، ج ۵۷، ص۳۰-۲۹

۶۸- ابن کثیر، مرجعِ سابق، ج۱۲، ص۲۵۳

۶۹- طبری، تفسیر ابن جرير الطبري، ج ۱۲، ص ۱۲؛ ابو عبداللہ الحاکم نیسابوری، المستدرك على الصحيحين، بیروت، دارالفکر، ۱۳۹۸ھ - ۱۹۷۸ء، ج۲، ص۵۱۴؛ بیہقی، شعب الإيمان، ج۲، ص۴۲۴

وكل من قرأ هذه الآية يعلم أنه من نبات الأرض.“[۷۰] (اس کی سند صحیح ہے اوراسے کئی لوگوں نے سیدناانس رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیاہے، اس سے مراد یہ ہے کہ اس کی شکل وصورت اوراس کی تعیین معلوم نہیں، ورنہ اتناتوصرف آیت کے پڑھنے سے ہر ایک قاری کوصاف طورپر معلوم ہورہاہے کہ یہ زمین سے اُگنے والی کوئی چیز ہے۔)مولانا حمیدالدین فراہی[۷۱] لکھتے ہیں:”یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی کہ سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما، جیساکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتاہے، اِس لفظ سے ناواقف تھے۔اس روایت کاپہلا حصہ منقطع ہے اوردوسراحصہ مضطرب اور مندرجہ ذیل وجوہ سے ہمارے نزدیک یہ روایت بالکل ضعیف ہے، اس لیے کہ:

۱- یہ سورت مکی ہے۔ مکی زندگی میں صحابہ رضی اللہ عنہم کااصلی مشغلہ قرآن مجید کاپڑھناپڑھانا ہی تھا، اگر یہ لفظ اُن کو معلوم نہ تھاتودن رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے سہنے کے باوجود انھوں نے اِس کو آپ سے کیوں نہیں دریافت کیا؟اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو کیوں نہیں بتایا؟کیاصحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید سے اس قدربے پرواتھے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوچکی ،تب انھیں معلوم ہوا کہ یہ لفظ بغیر تحقیق کے رہ گیاہے اوراُس وقت اُن کو اِس کے عدمِ علم کااعتراف کرناپڑا۔

۲- قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتاہے کہ اِس کی زبان نہایت واضح اور سہل ہے۔ عرب کے اشعاراور خطبات کی جوعام زبان تھی اُسی زبان میں وہ نازل ہواہے۔عکاظ میں جوکلام پیش ہوتے اُن کے حُسن وقبح کافیصلہ قریش ہی کرتے تھے۔سیدناابوبکر رضی اللہ عنہم کاشمار عرب کے مشہور سرداروں اور خطیبوں میں ہوتاتھااور سیدناعمر رضی اللہ عنہم توگویاقریش کی زبان اوراُن کے ترجمان تھے۔کلام پراُن کی تنقیدیں اہلِ علم سے مخفی نہیں ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے

۷۰- ابن کثیر، مرجع سابق، ج۱۲، ص۲۵۳

۷۱- برعظیم کے ممتاز عالم دین، ضلع اعظم گڑھ (U-P، بھارت) کے ایک گاؤں پھریہار میں ۱۲۸۰ھ کو پیداہوئے۔ آپ مولاناشبلی نعمانی کے ماموں زاد بھائی تھے اور مولاناشبلی اُن سے چھ سال بڑے تھے۔علوم کواپنے دور کے بڑے علما سے حاصل کیا۔ مولاناعبدالحی لکھنوی کے شاگرد بھی رہے ہیں۔نہایت فطین اورذکی تھے۔ عربی زبان میں مہارت کے ساتھ ساتھ عبرانی زبان پر بھی عبوررکھتے تھے۔ مسلم علی گڑھ کالج کے پروفیسر رہے ہیں ۔۱۳۴۹ھ کووفات پائی۔(**شاہکاراسلامی انسائیکلوپیڈیا**، ج۲، ص۱۲۴۶)

کہ زبان کے معاملے میں اُن کا رُتبہ کس قدر بلند تھا۔ پھر حیرت یہ ہے کہ ماہرین ادب ولغت قرآن مجید کے ایک لفظ سے بالکل بے خبر رہ گئے۔

۳- قرآن مجید عرب کی نہایت معروف اور کھلی ہوئی زبان میں اُترا، تاکہ لوگوں کو اِس کے ذریعے سے دین کی دعوت دی جائے اور لوگ اِس کی تعلیمات آسانی سے سمجھ لیں، اِس بات کو خود قرآن مجید نے مختلف موقعوں پر مختلف انداز سے بیان کیا ہے، مثلاً فرمایا: ﴿ وَمَآ أَرۡسَلۡنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوۡمِهِۦ لِيُبَيِّنَ لَهُمۡۖ ﴾[۷۲] (ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اُس کی قوم کی زبان کے ساتھ تاکہ انھیں خوب وضاحت کرے۔) ایک دوسری جگہ فرمایا: ﴿ إِنَّآ أَنزَلۡنَٰهُ قُرۡءَٰنًا عَرَبِيّٗا لَّعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُونَ ﴾[۷۳] (ہم نے اِس کو بنایا عربی قرآن تاکہ تم اِس کو سمجھ سکو۔) پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قرآن مجید ایسے لفظ استعمال کرے جن کے معنی بڑے بڑے صحابہ کو بھی معلوم نہ ہوں؟ یہ بات تو اِس کے عربی مبین ہونے کے صریح خلاف ہو گی۔

۴- جن لوگوں نے یہ روایت گھڑی ہے، انھوں نے اِس کو اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف منسوب کر دیا ہے اور یہ معلوم ہے کہ جو لوگ صحابہ رضی اللہ عنہم کو بدنام کرنے کے شائق تھے وہ بیش تر بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم ہی کو نشانہ بناتے تھے۔[۷۴]

أَبَارِيْقٌ

إِبْرِيْقٌ کی جمع ہے، جس کے معنی لوٹے، صراحی، جگ اور آب خورے کے ہیں۔ فارسی کے "آب ریز" کا مُعَرَّب ہے[۷۵]، پانی کا راستہ، ٹھہر ٹھہر کر پانی گرانا۔[۷۶] قرآن مجید میں ہے کہ: ﴿ يَطُوفُ عَلَيۡهِمۡ وِلۡدَٰنٞ

۷۲- إبراهيم:۴

۷۳- يوسف: ۲

۷۴- ملاحظہ کیجیے: حمید الدین فراہی، **مجموعہ تفاسیر فراہی**، ترجمہ: امین احسن اصلاحی، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ط ۲، اکتوبر ۱۹۹۸ء، ص ۲۷۰

۷۵- مجد الدین فیروز آبادی نے اسے "آب ری" کا معرب مانا ہے، جو غلط ہے۔

۷۶- ابو الحسن علی بن اسماعیل سیدہ مرسی، **المحکم والمحیط الأعظم**، تحت: مقلوبة ب ر ق، ابن منظور، **لسان العرب**، تحت لفظ: ق، فصل الباء، فیروز آبادی، **القاموس المحیط**، تحت: باب القاف، فصل الباء، زبیدی، **تاج العروس**، باب القاف، فصل الباء مع القاف، ب ر ق.

مُخَلَّدُونَ . بِأَكْوَابٍ وَأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّن مَّعِينٍ ﴾[۷۷] (اُن کی خدمت میں غلمان، جو ہمیشہ غلمان ہی رہیں گے، پیالے جگ اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے گردش کر رہے ہوں گے۔)

اور سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت میں ہے کہ: ﴿إِنَّ أَمَامَكُمْ حَوْضًا كَمَا بَيْنَ جَرْبَاءَ وَأَذْرُحَ، فِيهِ أَبَارِيقُ كَنُجُومِ السَّمَاءِ مَنْ وَرَدَهُ فَشَرِبَ مِنْهُ لَمْ يَظْمَأْ بَعْدَهَا أَبَدًا﴾[۷۸] (حشر میں تمھارے سامنے حوض (کوثر) ہو گا جس کے دونوں کناروں میں اتنا فاصلہ ہے جتنا کہ جَرْبَاء اور أَذْرُحَ میں، اُس پر آسمان کے ستاروں کے مانند آب خورے ہیں، جو اس کے پاس آکر پانی پیے گا اس کے بعد وہ کبھی تشنہ نہیں ہو گا۔) جَرْبَاء اور أَذْرُحَ ملک شام میں دو گاؤں کے نام ہیں، جن کے درمیان تین منزل کا فاصلہ ہے، یہاں یہودی آباد تھے، جن کے نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امن نامہ لکھا تھا۔[۷۹] لحیانی[۸۰] کہتے ہیں: "إبريق: إذا كانت برّاقة."[۸۱] (یہ برق سے ہے اور ہر چمک دار اور خوب صورت چیز کے لیے بولا جاتا ہے۔)

إبراهيم عليه السلام

جوالیقی لکھتے ہیں: "أسماء الأنبياء كلها أعجمية نحو: إبراهيم وإسمٰعيل وإسحٰق و إلياس وإدريس وإسرائيل وأيوب إلاَّ أربعة أسماء وهي: آدم وصالح وشعيب ومحمد عليهم

۷۷- الواقعة: ۱۷ - ۱۸

۷۸- صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب إثبات حوض نبينا أوصفاته، حديث: ۳۵-[۲۲۹۹]

۷۹- مجد الدين ابو السعادات المبارک بن محمد بن اثير جزری، النهاية في غريب الحديث، بيروت، دار الكتب العلميه، ۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۷ء، ج ۱، ص ۲۴۶

۸۰- علی بن مبارک اور ایک روایت کے مطابق: ابن حازم - ابو الحسن لحیانی۔ بنو لحیان بن ہذیل بن مدرکہ کی نسبت سے لحیانی کہلائے۔ بعض کا خیال ہے کہ لمبی داڑھی رکھنے سے لحیانی کہلائے۔ امام کسائی کے شاگرد رہے ہیں۔ تاریخ تولد اور تاریخ وفات دستیاب نہیں۔ (جلال الدین سیوطی، بغية الوُعاة في طبقات اللغويين و النحاة، لبنان، المكتبة العصرية، ج ۲، ص ۱۸۵

۸۱- ابو منصور محمد بن احمد ازہری، تهذيب اللغة، أبواب القاف و الراء

السلام."[۸۲] (سارے انبیا کے نام عجمی ہیں، جیسے سیدنا ابراہیم، سیدنا اسماعیل، سیدنا اسحاق، سیدنا ادریس، سیدنا اسرائیل اور سیدنا ایوب علیہم السلام، البتہ چار انبیا کے نام عربی ہیں: سیدنا آدم، سیدنا صالح، سیدنا شعیب اور سیدنا محمد علیہم السلام)

ابْلَعِيْ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَقِيلَ يَٰٓأَرۡضُ ٱبۡلَعِي مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ أَقۡلِعِي وَغِيضَ ٱلۡمَآءُ وَقُضِيَ ٱلۡأَمۡرُ وَٱسۡتَوَتۡ عَلَى ٱلۡجُودِيِّۖ ﴾[۸۳] (اور حکم ہوا کہ اے زمین! اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تھم جا اور پانی اُتار دیا گیا اور معاملے کا فیصلہ ہو گیا اور کشتی کوہِ جودی کو جا لگی۔)

ٱبْلَعِي: "تو نگل جا" (باب فَتَحَ) بَلْعٌ (بہ معنی نگلنا) سے امر کا صیغہ ہے۔ واحد مونث حاضر؛ وہب بن منبہ[۸۴] سے منقول ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔[۸۵] ڈاکٹر تونجی لکھتے ہیں کہ: "ابلعي: ازدري، قيل: هي حبشية، وقيل هندية."[۸۶] (ابلعي کے معنی ازدري کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے اور یہ بھی ایک قول ہے کہ یہ ہندی زبان کا قول ہے۔)

سید آلوسی بغدادی لکھتے ہیں:

وَقِيلَ يَٰٓأَرۡضُ ٱبۡلَعِي أي: أي انشفي استعير من ازدراد الحيوان ما يأكله للدلالة على أن ذلك ليس كالشف المعتاد التدريجي، استُعيرمِن:ازدرادَ الحيوان ما ما يأكله للدلالة على أن ذلك ليس

۸۲- جوالیقی، **المعرب**، ص ۱۰۲

۸۳- هود: ۴۴

۸۴- ابو عبداللہ وہب بن منبہ ابناوی صنعانی ذماری ابو عبداللہ، ۳۴ھ - ۶۵۴ء کو صنعا میں پیدا ہوئے۔ مؤرخ اور اسرائیلیات کے بہت بڑے عالم ہیں۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے انھیں صنعا کا قاضی مقرر کیا تھا۔ ۱۱۴ھ - ۷۳۲ء کو صنعا میں وفات پائی۔ (ابن خلکان، **وفیات الأعیان**، ج۶، ص۳۵-۳۶؛ خیر الدین زرکلی، **الأعلام**، ط۱۵، ج۸، ص۱۲۵)

۸۵- ابن ابی حاتم، **تفسیر ابن أبي حاتم**، سعودی عرب، مکتبة نزار مصطفی الباز، ط۳، ۱۴۱۹ھ، ج۶، ص۲۰۳۶

۸۶- التونجی، **المعرب والدخیل**، ص۱۹۲

كالشف المعتاد التدريجي... وأخرج ابن المنذر وغيره عن وهب بن منبه أن البلع بمعنى الازدراد لغة حبشية، وأخرج أبو الشيخ عن جعفر بن محمد عن أبيه أنه بمعنى الشرب لغة هندية. [۸۷]

وَقِيلَ يَٰٓأَرۡضُ ٱبۡلَعِي میں ٱبۡلَعِي کے معنی انشفي (خشک کرنے، نگل جانے) کے ہیں۔ یہ استعارہ ہے کیوں کہ یہ لفظ حیوان کے لیے مستعمل ہے۔ اس کو زمین کے چوس لینے میں استعارہ فرمایا، اس معنی میں کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ زمین کا یہ چوس لینا ویسا تدریجی نہ تھا جیسا کہ از راہِ عادت دیکھا جاتا ہے... اور ابن المنذر [۸۸] نے وہب بن منبہ سے نقل کیا ہے کہ حبشی زبان سے ماخوذ اس لفظ کے معنی حیوان کی مانند نگل لینے کے ہیں اور ابو الشیخ [۸۹] نے جعفر بن محمد عن ابیہ کے سند سے نقل کیا ہے کہ ہندی زبان میں اس کے معنی چوس لینے اور پی جانے کے ہیں۔

إبليس

شیطان کا نام ہے بروزنِ إفعیل، إبلاس سے مشتق ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں: "الإبلاس: الحُزنُ المُتَرِضُ مِن شِدَّة اليأس، ومنه اشتُقَّ إبليس فيما قيل." [۹۰] (الإبلاس کے معنی سخت نا اُمیدی کے باعث غم گین ہو کر ششدر و متحیر ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ چوں کہ شیطان حق تعالیٰ کی رحمت سے نا امید ہے اس لیے اس کا نام ابلیس ہوا۔) ابن عرفہ [۹۱] کی رائے بھی یہی ہے کہ: "الإبلاس: الحيرة واليأس،

۸۷- سیوطی، **الإتقان**، ج۱، ص۱۸۰؛ الوسی، **روح المعاني**، ج۱۲-۱۱، ص۳۶۲

۸۸- محمد بن ابراہیم بن منذر نیشاپوری، ابو بکر، فقیہ و مجتہد اور حافظ حدیث تھے۔ مکہ مکرمہ میں شیخ الحرم تھے۔ ۲۴۲ھ / ۸۵۶ء کو پیدا ہوئے۔ اَن گنت مفید کتابیں لکھیں ۳۱۹ھ / ۹۳۱ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔ (ابن خلکان، مرجعِ سابق، ج ۴، ص۲۰۷؛ زرکلی، مرجعِ سابق، ج۵، ص۲۹۴)

۸۹- عبد اللہ بن محمد بن جعفر بن حبان اصبہانی ابو محمد / ابو الشیخ ۲۷۴ھ / ۸۸۷ء کو پیدا ہوئے۔ حافظ حدیث اور رجالِ حدیث کے بڑے عالم تھے۔ اپنے دادا حبان کی نسبت سے حِبَّانی کہلاتے ہیں۔ حصول علم کے لیے موصل، حران، حجاز مقدس اور عراق کے سفر کیے ۳۶۹ھ - ۹۷۹ء کو وفات پائی۔ (حافظ ذہبی، **العبر في من غبر**، تحقیق: ابوہاجر محمد السعید بن بسیونی زغلول، بیروت، دار الکتب العلمیہ، بدون تاریخ، ج۲، ص۱۳۲؛ زرکلی، مرجعِ سابق، ج۴، ص۱۲۰)

۹۰- راغب، **المفردات**، ص۶۰

۹۱- علی بن المظفر بن ابراہیم بن عمر بن یزید الوداعی کندی اسکندرانی ثم دمشقی ۶۴۰ھ / ۱۲۴۲ء کو پیدا ہوئے۔ ادیب، متفنن، شاعر اور حدیث و قراءت کے بڑے عالم تھے۔ ۲۰۰ کے قریب اَساتذہ سے کسب فیض کیا، اسکندریہ سے تعلق تھا۔ (جاری)

و منه سُمِّيَ إبليس، لأنه أبلس عن رحمة الله أي:أيِس منها وتَحَيَّرَ."[۹۲] (إبلاس کے معنی حیرت ویاس کے ہیں، ابلیس کا نام بھی اسی سے مشتق ہے، کیوں کہ وہ رحمت الٰہیہ سے ناامید ہو گیا ہے۔) لیکن زمخشری نے اپنی تفسیر میں لفظِ ادریس پر بحث کرتے ہوئے تصریح کی ہے: "وكذلك إبليس أعجمي، وليس من الإبلاس كما يزعمون ولايعقوب من العقب ولا إسرائيل بإسرِإلَّ كما زعم ابن السِّكِّيت، ومن لم يتحقق ولم يتدرب بالصناعة كَثُرَتْ منه أمثال هذه الهنات."[۹۳] (ابلیس عجمی لفظ ہے اور اس کا اشتقاق إِبْلاسٌ سے بتانا صحیح نہیں، اس لیے کہ یہ غیر منصرف ہے[۹۴] اور غیر منصرف ہونے کے لیے تو اسباب منع صَرف میں سے کم از کم دو سبب یا وہ ایک سبب جو دو سببوں کے قائم مقام ہو، پایا جانا ضروری ہے اور إِبْلاسٌ سے مشتق ہونے کی صورت میں اس میں سوائے عَلَمِیَّت کے کوئی دوسرا سبب پایا نہیں جاتا، اس لیے غیر منصرف ہونا اس کے عجمی ہونے کی دلیل ہے۔)

اور ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

فإن قال قائل: فإن كان إبليس، كما قلت،"إفعيل" من الإبلاس، فهلا صرف وأجري؟ قيل: ترك إجراؤه استثقالا إذ كان اسما لا نظير له من أسماء العرب، فشبهته العرب- إذ كان كذلك- بأسماء العجم التي لا تجرى. وقد قالوا: مررت بإسحاق، فلم يجرّوه. وهو من"أسحقه الله إسحاقا"، إذ كان وقع مبتدأ اسما لغير العرب، ثم تسمت به العرب فجرى مجراه - وهو من أسماء العجم - في الإعراب فلم يصرف. وكذلك"أيوب"، إنما هو"فيعول" من"آب يؤب".[۹۵]

(گذشتہ سے پیوستہ)

رہائش دمشق میں تھی اور وہیں ۷۱۶ھ-۱۳۱۶ء کو وفات پائی۔ (عسقلانی، الدرر الكامنة، ج ۳، ص ۱۳۰؛ زرکلی، مرجع سابق، ج ۵، ص ۲۳)

۹۲- ہروی، الغريبين في القرآن والحديث، ص ۲۱۰

۹۳- زمخشری، الكشاف، ج ۳، ص ۲۳-۲۴

۹۴- وہ اسم ہے جو تنوین (دوزبر، دوزیر اور دوپیش) قبول نہ کرے۔

۹۵- طبری، تفسير الطبري، ج ۱، ص ۲۶۵

اگر کوئی سوال اُٹھائے کہ جب تمھارے قول کے مطابق إبليس (إفعيل کے وزن پر) إبلاس سے مشتَق ہے تو یہ غیر منصرف کیوں ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عربی لفظ ہے، لیکن ثقیل ہونے کے باعث یہ غیر منصرف ہے اور عربی اَسما میں اس کی نظیر و مثال نہ ہونے کی وجہ سے عربوں نے اس سے عجمی اسم کا سا سلوک کر دیا اور اس کے قوانین و احکام اس پر لاگو کر دیے، اسی کی مانند ہیں إسحاق، جو أسحقه الله سے، اور أيوب، جو آب يؤب سے فيعول کے وزن پر ہے۔

جوالیقی لکھتے ہیں: "وإبليس ليس بعربي وإن وافَقَ أبْلَسَ الرَّجلُ إذا انقطعت حجته إذ لو كان منه لصُرِفَ، ألا ترى أنک لوسميت رجلًا بـإخريط وإجفيل لصرفته في المعرفة، ومنهم من يقول: هو عربي، ويَجعَلُ اشتقاقه مِنْ أبْلَسَ يُبْلِسُ أي:يَئِسَ، فكأنه أبْلَسَ مِن رحمة الله أي:يَئِسَ منها، والقول هو الأول."[۹۶] (اِبلیس عربی زبان کا لفظ نہیں اگرچہ أبْلَسَ الرَّجلُ سے موافقت و مطابقت رکھتا ہے، اس لیے کہ عربی ہونے کی صورت میں منصرف ہوتا جیسا کہ کسی کا نام اگر إخريط یا إجفيل ہے تو معرفہ ہونے کی صورت میں یہ نام منصرف ہوتے ہیں، جب کہ بعض علما کا خیال ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے جو أبْلَسَ يُبْلِسُ بہ معنی ناامیدی سے مشتَق ہے اور ان کے خیال میں اس لفظ کو شیطان کے لیے اس لیے استعمال کیا گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور ناامید ہو گیا ہے، لیکن پہلا قول درست ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔) حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ ابلیس عربی زبان کا لفظ نہیں ہے۔[۹۷]

ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں:"هو يوناني، وأصله دِ يَابُلُس، ومعناه: النَّمَّامُ والعَدُوُّ والشيطان."[۹۸] (یہ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کی اصل دِيَابُلُس ہے اور اس کے معنی چغلی کھانے والا، دشمن اور شیطان کے آتے ہیں۔)

۹۶- جوالیقی، المعرب، ص ۱۲۲

۹۷- ابن جوزی، فنون الأفنان، ص ۱۱۵

۹۸- بلاسی، المعرب في القرآن الكريم، ص ۱۲۲

أَخْلَدَ

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَٰهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُۥٓ أَخْلَدَ إِلَى ٱلْأَرْضِ ﴾[۹۹] (اور اگر ہم چاہتے تو اُس کو اُن آیات کے ذریعے سے بلند کرتے، لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔) سیوطی لکھتے ہیں:"قال الواسطي في **الإرشاد**: أَخْلَدَ إِلَى ٱلْأَرْضِ: رَكَنَ، بالعبرية."[۱۰۰] (واسطی نے **الإرشاد** میں فرمایا ہے کہ أَخْلَدَ إِلَى ٱلْأَرْضِ کے معنی رَكَنَ (جھک جانے) کے ہیں اور یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔) اصل میں أخلد إلي الشيء کے معنی کسی شے کی طرف اس طرح جُھک جانے اور مائل ہو جانے کے ہوتے ہیں کہ آدمی بس اُسی کا ہو کر رہ جائے۔ یہ اُس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جو اُس نے ہدایت وضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے اگر اُن کی عقل کو اُن سے رفعت اور اُن کی روح کو اُن سے معراج حاصل ہوتی ہے لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں ہی کے پیچھے اور کتے کی طرح زمین کو سونگھتے ہی ہوئے چلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اُن کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے اور وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

إدريس

اللہ تعالی کے جلیل القدر نبی تھے، اُن کا نام قرآن عزیز میں دوبار آیا ہے: ﴿ وَٱذْكُرْ فِى ٱلْكِتَٰبِ إِدْرِيسَ ۚ إِنَّهُۥ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴾[۱۰۱] ﴿ وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا ٱلْكِفْلِ ۖ كُلٌّ مِّنَ ٱلصَّٰبِرِينَ ﴾[۱۰۲] مجد الدین فیروز آبادی لکھتے ہیں: "واسمه بالسّريانية خنوخ ويُقال أَخْنوخ، ومعناه كثير العِبادة."[۱۰۳] (ان کا نام سریانی میں خنوخ یا اخنوخ ہے جس کے معنی بہت زیادہ عبادت گزار ہونے کے ہیں۔) یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

۹۹- الأعراف: ۱۷۶

۱۰۰- سیوطی، **الإتقان**، ج۱، ص۱۸۰؛ سیوطی، **المهذب في المعرب**، ص۳۵

۱۰۱- مریم: ۴۱

۱۰۲- الأنبياء: ۸۵

۱۰۳- فیروز آبادی، **بصائر ذوي التمييز**، بیروت، المكتبة العلمية، بدون تاریخ، ج۶، ص۵۱

"مشتق من الدرس والدراسة بمعنى القراءة، سمى به لكثرة ما درس من كتب الله عزوجل."[۱۰۴] ((عربی ہونے کی صورت میں) اس کا اِشتقاق دِرَاسَة سے ہے جس کے معنی پڑھنے، یاد کرنے کے ہیں۔ صحف الٰہیہ کے مطالعے اور کثرتِ درس و تدریس کی وجہ سے آپ کو ادریس کہا گیا۔) لیکن زمخشری اسے نادرست کہتے ہیں۔[۱۰۵] فیروز آبادی کو بھی اعتراف ہے کہ :"وأما إدريس فإسمٌ عجميٌ غيرُ منصرِفٍ."[۱۰۶] (ادریس عجمی نام اور غیر منصرف ہے۔) یہ بھی لکھتے ہیں: "إدريس النبي ليس مِنَ الدِّرَاسة كما توهمه كثيرون، لأنه أعجمي."[۱۰۷] (سیدنا ادریس کا نام دِرَاسة (پڑھنے پڑھانے) کی وجہ سے نہیں، جیسا کہ بہت سے لوگوں کو وہم ہوا ہے، اس لیے کہ یہ عجمی لفظ ہے (نہ کہ عربی)۔) زمخشری کہتے ہیں کہ: "وهوغيرصحيح لأنه لوكان إفعيلًا من الدرس لم يكن فيه اِلاَّسببٌ واحدٌ، وهو العَلَمِية فكان منصرفًا، فامتناعه من الصَّرف دليلُ العُجْمةِ."[۱۰۸] (اگر ادریس کو إفعيل وزن پر درس سے مشتق مانا جائے تو اسے منصرف ہونا چاہیے، کیوں کہ اس صورت میں اس میں ایک سبب یعنی علمیت باقی رہتی ہے حالاں کہ یہ منصرف نہیں بلکہ غیر منصرف ہے، اس لیے اس کا غیر منصرف ہونا اس کی عجمیت کی دلیل ہے۔) زمخشری نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ: "ويجوزأن يكون معنى إدريس في تلك اللغة قريبًا من ذلك فحسبه الراوي مشتقًا من الدرس."[۱۰۹] (ممکن ہے ادریس جس زبان کا لفظ ہو اسی زبان میں اس کے معنی درس و دِراست سے ملتے جلتے ہوں، جس سے راوی نے اس کو درس سے مشق خیال کر لیا ہو۔)

۱۰۴- فیروز آبادی، نفس مصدر، ج۶، ص۵۱؛ ابن منظور، **لسان العرب**، بہ ذیل مادہ: "درس"

۱۰۵- زمخشری، مصدرِ سابق، ج۳، ص۲۳

۱۰۶- فیروز آبادی، مصدرِ سابق، ج۶، ص۵۱

۱۰۷- فیروز آبادی، **القاموس المحیط**، بہ ذیل مادہ: "درس"

۱۰۸- زمخشری، مصدرِ سابق، ج۲، ص۲۳

۱۰۹- زمخشری، مصدرِ سابق، ج۳، ص۲۳، قرطبی، **تفسیر القرطبي**، ج۱۱، ص۱۰۸

أرائك

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ﴿ هُمْ وَأَزْوَٰجُهُمْ فِي ظِلَٰلٍ عَلَى ٱلْأَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔونَ ﴾[١١٠] (وہ بھی اور اُن کے جوڑے بھی سایوں میں تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔) أَرَائِكِ، أَرِيْكَةٌ کی جمع ہے۔ تخت، چارپائی اور مسہری کو کہتے ہیں جس پر پردے پڑے ہوئے ہوں اور ہر وہ چیز جس پر ٹیک لگائی جائے۔ راغب لکھتے ہیں: "لأريكة:حجلة على سرير، جمعها: أرائك، وتسميتها بذلك إمّا لكونها في الأرض متّخذة من أراكٍ، وهو شجرة، أو لكونها مكانا للإقامة من قولهم: أَرَكَ بالمكان أُرُوكًا. وأصل الأروك: الإقامة على رعي الأراك، ثم تجوّز به في غيره من الإقامات."[١١١] (مسہری اور چھپر کھٹ کو أريكة کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ بالعموم أراك (پیلو) کی لکڑی سے بنایا جاتا تھا اور یا اس لیے کہ یہ أَرَكَ بالمكان أُرُوكًا سے مشتق ہے جس کے اصل معنی الأروك کے ہیں یعنی کسی جگہ پر أراك (پیلو) کے پتے چرنے کے لیے ٹھہرنے کے ہیں، پھر مطلق ٹھہرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔)

رہی یہ بات کہ یہ کس زبان سے آیا؟ اس سلسلے میں ابن جوزی لکھتے ہیں: "وبِلُغةِ الحَبَشِ:... الأرائك: السُّرُر."[١١٢] (حبشی زبان میں أرائک کے معنی تختوں کے ہیں۔) سیوطی لکھتے ہیں: "حكى ابن الجوزي في **فنون الأفنان** أنها السُّرُرُ بالحبشية."[١١٣] (ابن جوزی نے **فنون الأفنان** میں نقل کیا ہے کہ حبشی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی تخت کے ہیں۔) خطیب شربینی[١١٤] لکھتے ہیں: "روى أبوعبيدة في **الفضائل** عن الحسن قال: كُنَّا لاندري ما الأرائك حتى لقينا رجلٌ من أهل اليمن فأخبرنا

١١٠- يس: ٥٦

١١١- راغب اصفہانی، **المفردات**، ص١٦

١١٢- ابن جوزی، **فنون الأفنان**، ص١١٨

١١٣- سیوطی، **الإتقان**، ج١، ص ١٨٠

١١٤- محمد بن احمد شربینی، شمس الدین، شافعی فقیہ اور مفسر قرآن تھے۔ قاہرہ سے تعلق تھا۔ کئی علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ٩٧٧ھ - ١٥٧٠م کو وفات پائی۔ (دمشقی، **شذرات الذهب**، ج٨، ص٤٨٤؛ ذہبی، **سير أعلام النبلاء**، ج٦، ص٦)

أن الأريكة عندهم الحجلة فيهاالسرير. وهذا جزاء لماكانوا يلزمون المساجد ويغُضُّون أبصارهم و يضعون نفوسهم لأجلنا."[۱۱۵] (ابوعبیدۃ نے **فضائل** میں حسن بصری کے حوالے سے نقل کیاہے کہ ہم أرائک کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے یہاں تک کہ ہمارے پاس ایک یمنی شخص آیا، اُس نے ہمیں بتایا کہ اُن کے ہاں حجلۂ عروسی میں بچھی ہوئی پلنگ کو اَریکہ کہاجاتاہے اور یہ اُن لوگوں کی جزاہے جو بہ کثرت مساجد میں آتے جاتے اوراپنی نگاہوں اور شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔) ثعلب کہتے ہیں کہ: "الأريكة لاتكون إلاَّسريرًا مُتَّخَذًا في قُبَّةٍ عليه شَوارُهُ ونَجْدُهُ."[۱۱۶] (الأريكة کے معنی مزین تخت کے ہیں جو قُبَّۃ (حجلہ عروسی) کے اندر ہو اور جس پر پردہ لٹکاہوا ہو۔)

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "واحدهاأريكةٌ، وهي السرير المُنَجَّدُ، الفرش الجميل۔ والكلمة فارسيةٌ مركبة مِن آرا: زينة، ونيک: جميل، ويلفظونها:اورنگ."[۱۱۷] اس کامفرد اَرِیکَۃٌ ہے، جو آراستہ و پیراستہ چھپر کھٹ کو کہتے ہیں، جس پر خوب صورت مسہری ہو، جو آرااورنیک سے مرکب ہے، وہ اورنگ سے اس کا تلفظ کرتے ہیں۔

أَسَاطِيْرٌ

سَطَرَيَسْطُرُسَطْرًا سے ہے۔اہل لغت نے اس کے بنیادی معنی یہ کیے ہیں: "السطرُ:الصَّفُّ من الشيء كالكتاب والشجروالنخل."[۱۱۸] (کسی شے کاصَف بند (سیدھی لائنوں میں) ہونا، جیسے کتاب کی سطور اور درختوں اور کھجوروں کی لائن۔) یہ لفظ جمع کی صورت میں قرآن مجید میں نو جگہ مستعمل ہے۔ سورة الأنعام:۲۵،سورةالأنفال:۳۱،سورة النحل:۲۴،سورة المؤمنون:۸۳،سورة الفرقان:۵،

۱۱۵- شربینی، **تفسیرسراج المنیرفي الإعانة على معرفة بعض كلام ربنا الحكيم الخبير**، بیروت، دارالکتب العلمیة، ۱۴۲۹ھ-۲۰۰۸ھ، ج ۳،ص ۴۳۵

۱۱۶- ابوالحسین احمد بن فارس بن زکریا رازی، **مجمل اللغة**، كتاب الألف، باب الألف والراء، ومايثلثهما

۱۱۷- تونجی، **المعرب والدخيل**،ص ۱۹۲

۱۱۸- زبیدی، **تاج العروس**،بہ ذیل مادہ: "س ر ط"

سورة النمل:۶۸،سورة الاحقاف:۱۷، سورة القلم:۱۵ اور سورة المطففين:۱۳۔ ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "واحدها أُسطورَةٌ بمعنى القصة والحكاية، من اليونانية Histori أي:تاريخ، وعربت بالأباطيل من الأحاديث."[۱۱۹] (اس کا واحد اُسْطُوْرَةٌ ہے، جس کے معنی حکایت، قصہ اور کہانی کے ہیں۔یونانی زبان کے Histor سے ہے جس کے معنی تاریخ کے ہیں، لیکن یہ معرب ہو کر اپنے معنوں میں نہ رہا، بلکہ عربی زبان میں یہ جھوٹے واقعات، کہانیوں اور افسانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔)

أَسباط

اس مادے کا بنیادی معنی کسی چیز کے دراز ہونے کے ہیں، چناں چہ اہل لغت نے لکھا ہے: "أسبَطَ الرجلُ اِسباطًا: إذا امْتَدَّ وانبسطَ على الأرضِ من الضَّربِ."[۱۲۰] (أسبطَ الرجلُ اِسباطًا: اُس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی زمین پر کسی کے مارنے سے لیٹ کر دراز ہو جائے۔) مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں: "السَّبْطُ:الشجرةُ لهاأغصانٌ كثيرةٌ وأصلهاواحدٌ، ومنه اشتقاق الأسباط، كأنَّ الوالد بمنزله الشجرة والأولا دبمنزلة أغصانها."[۱۲۱] (السَّبْطُ ایک درخت یا جھاڑی کو کہتے ہیں جس کی جڑ تو ایک ہوتی ہے لیکن شاخیں بہت پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، یہیں سے اس کے معنی نسل اور خاندان کے ہو گئے ہیں، یعنی باپ بمنزلہ جڑ کے ہے اور اولاد بمنزلہ شاخوں کے۔ أَسْبَاطٌ، سِبْطٌ کی جمع ہے، پوتے اور نواسے دونوں کو کہتے ہیں مگر نواسے کے معنی میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ اَزہری لکھتے ہیں: "أنَّ الأسباطَ في ولد إسحٰق بمنزلة القبائل في ولد إسمٰعيل فولدكل ولد من أولاد إسحٰق سِبطٌ و ولدكل ولد من أولاد إسمٰعيل قبيلةٌ ، وإنما سُمُّوا هؤلاءِ بالأسباط وهؤ لاء بالقبائل ليُفْصل بين ولد إسمٰعيل و

۱۱۹- تونجی،**المعرب والدخيل**،ص۱۹۲

۱۲۰- ازہری، **تهذيب اللّغة**، باب السين و الطاء مع اللّام؛ابوالحسین احمد بن فارس بن زکریا رازی، **مجمل اللغة**، باب السين و الباء وما يثلثهما

۱۲۱- زبیدی، مرجع سابق،فصل السين المهلمة مع الطاء، س ب ط

ولد إسحٰق عليهما السلام." [۱۲۲] (سیدنا اسحاق کی اَولاد کے لیے اَسباط کا لفظ اس طرح مستعمل ہے، جیسا کہ سیدنا اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام کی اولاد کے لیے قبائل کا لفظ مستعمل ہے۔ عربوں نے یہ تخصیص اس لیے رکھی تھی کہ محض ایک لفظ سے سیدنا ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کی اولاد کی دونوں شاخوں: بنو اسحاق اور بنو اسماعیل میں امتیاز ہو جائے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں کہ اَسباط عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ [۱۲۳] قرآن مجید میں یہ لفظ اِن مقامات میں وارد ہے: سورة البقرة:۱۳۶، ۱۴۰، سورة آل عمران:۸۴، سورة النساء: ۱۶۲ اور سورة الأعراف:۱۶۰

اِسْتَبْرَق

یہ لفظ قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے: سورة الكهف:۳۱، سورة الدخان:۵۳، سورة الرحمن:۵۴ اور سورة الدهر:۲۱۔ جوالیقی لکھتے ہیں کہ: "والإستبرقُ:غليظ الديباج، فارسيٌّ معرَّبٌ، وأصله: اِسْتَفْرَةَ." [۱۲۴] (ریشم کا دبیز کپڑا اِستبرق کہلاتا ہے، یہ فارسی سے عربی میں در آیا ہے، اس کی اصل اِستفرہ ہے۔) ابن جوزی، زرکشی، سیوطی اور ڈاکٹر صلاح الدین منجد اسے فارسی سے معرب مانتے ہیں۔ [۱۲۵] ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں کہ: "أصله بالفارسية الجديدة سِتَبْرأوإسْتَبرْ، ومعناه الغليظ، ثم خُصَّ بغليظ الديباج، وهوبالفهلوية": Stapr، Stawr. [۱۲۶] (جدید فارسی میں اس کی اصل سِتَبْر یا

۱۲۲- ازہری، تہذیب اللغة، ج۱۲، ص۲۴۰

۱۲۳- ڈاکٹر تونجی، المعرب والدخيل، ص۱۹۲

۱۲۴- جوالیقی، المعرب، ص۱۰۸

۱۲۵- ابن جوزی، فنون الأفنان، ص۱۱۸؛ زرکشی، البرهان في علوم القرآن، ج۱، ص۲۸۸؛ سیوطی، الإتقان، ج۱، ص ۱۸۰؛ سیوطی، المهذب في المعرب فيما وقع في القرآن من المعرب، ص۱۰۶؛ صلاح الدین المنجد، المفصل في الألفاظ الفارسية المعربة، ص۸۳-۸۴

۱۲۶- جوالیقی، المعرب، ص۱۰۸؛ ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "نرى هؤلاء السَّادة العلماء لا يتقبَّلون كلمة ديباج أن يكون أصلها الپهلوي مركبًا من: ديو: الشيطٰن، وباف:نسج من المصدر بافتن، والمعنى الأصلي هونسج الشيطٰن، ثم صارالمعنى: نوعٌ من الحرير الفاخر، والتي عربت بمعنى الحريرالغليظ، (جاری)

اِسْتَبْر ہے، جس کے معنی سخت و دبیز ہونے کے ہیں، پھر دبیز ریشم کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا۔ پہلوی زبان میں اسے Stapr، Stawr کہتے ہیں۔)

إسحاق

جوالیقی لکھتے ہیں: "وإسحٰق أعجميٌّ وإن وافَقَ لفظَ العربِيَّ، ويُقالُ: أسحقه الله يُسْحِقُهُ اِسْحَاقا۔"[۱۲۷] اِسحاق عجمی ہے اگرچہ عربی سے موافق ومشابہ ہے۔ کہاجاتاہے: "أسحقه الله يُسْحِقُهُ اِسْحَاقًا" (عربی کے اسحاق کے معنی دور کرنے اور ہلاک کرنے کے ہیں۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "هو بالعِبرية، يِصحاق، وورد في التوراة بالسين أيضًا، و معناه: يضحک. وجعله بعضهم اِنشاءً بمعنى: لِيَبْتَسِمْ، بتقدير إيل."[۱۲۸] (عبرانی میں یہ "یِصحاق" ہے اور تورات میں اسحاق بھی وارِد ہے، اس کے معنی خوش وخرم کے ہیں۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ یہ اِنشائی نام ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اسے خوش وخرم رکھے۔)

آپ یہ بھی لکھتے ہیں: "والهمزة في أول الكلمة بدلًا من الياء كما في العبرية تدلُّ على كونه أدخلت في العربية من السريانية فهي فيها إسحاق."[۱۲۹] (اس کی ابتدا میں یا کے بجائے ہمزہ کی موجودگی اس بات کی غماز ہے کہ یہ سریانی سے عربی میں در آیاہے، اس لیے کہ سریانی میں اس کی اِملا، اِسحاق ہے۔) سیوطی نے ابوعلی مسکویہ کی کتاب **ندیم الفرید** کے حوالے سے لکھاہے: " أنَّ معنى إسحاق

(گذشتہ سے پیوستہ)

واشتق منها الفعل دَبَّجَ بمعنى: نَقَشَ، والديباجة: المقدمة الأدبية للرسائل وبعض الموضوعات."

(بعض علمائے اَعلام کو اس میں تامل ہے کہ دیباج کو پہلوی زبان کے دیوباف کا معرب مانا جائے، جس کے معنی ہیں: شیطان کا بُنا ہوا اور پھر اسے قیمتی ریشم کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور اس سے دَبَّجَ بمعنی نَقَشَ مشتق ہوا ہے۔ مکہ اور دیباچہ اس ادبی مقدمے کو کہتے ہیں جو اور دیباجہ نکلا ہو جسے کتابوں اور رسالوں کی ابتدا میں ہوتا ہے۔) (تونجی، **المعرب و الدخیل**، ص۶۵)

۱۲۷- جوالیقی، مصدرِ سابق، ص۱۰۶

۱۲۸- جوالیقی، مرجعِ سابق، ص۱۰۶

۱۲۹- جوالیقی، مصدرِ سابق، ص۱۰۶

بالعبرانية: الضحَّاک"[۱۳۰] (عبرانی میں اِسحاق کے معنی ضَحَّاکُ (ہنسنے والا، خوش وخرم) کے ہیں۔) اسحاق کے غیر منصرف ہونے کی ایک وجہ عَلَمِیَّتُ ہے دوسرے عُجْمَہ۔

أسرائیل

سیدنا یعقوب عَلَیْہِ السَّلَام کا عبرانی نام تھا، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہود کے ایک گروہ سے پوچھا تھا کہ: "هل تعلمون أن إسرائيل يعقوب؟ "[۱۳۱] (کیا تم جانتے ہو کہ اسرائیل یعقوب ہی تھے۔) سہیلی لکھتے ہیں: "وسمى إسرائيل لأنه أسري ذات ليلة حين ها جر إلى الله سبحانه فسمي إسرائيل: أي: سري الله، فيكون بعض الإسم عبرانيًاوبعضه سريانيًا."[۱۳۲] (اسرائیل کے معنی ہیں: رات کی تاریکی میں اللہ تعالی کی رضامندی کے لیے ہجرت کرنے والا، اس نام کا ایک حصہ عبرانی ہے اور دوسرا سریانی۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں:

هوبالعبرية، يِسرائيل، قيل معناهُ: يحاربُ الله وقال فيليب حِتِّي في تاريخ سورية ولبنان وفلسطين (۱:۱۹۱) إنَّ معناهُ ليَحكُمْ إيل، أَو إيل يحكُمُ، ووُجودالهمزة في أول الكلمة بدلاً من الياء في العبرية يدلُّ على كونة دخلَ في العربية عن طريق السريانية فهوفيها إسرائيل.[۱۳۳]

یہ عبرانی زبان میں يِسْرَائِيْل پڑھاجاتاہے، جس کے معنی يُحارب الله کے ہیں۔ فلپ حِتّی (Phillippe Hitti) نے تاریخ سوریا، لبنان اور فلسطین میں لکھاہے کہ "اس کا معنی ليَحكُمْ اِيل یاإيل يحكُمُ ہے۔" اس کی ابتدا میں یا

۱۳۰- سیوطی، الإتقان، ج۲، ص۱۷۶

۱۳۱- احمد بن حنبل، **مسند الإمام أحمد بن حنبل**، مسند عبد الله بن العباس بن عبدالمطلب؛ ابوداؤد سلیمان بن داود بن جارود طیالسی، **مسند أبي داود الطيالسي**، وما أسند عبدالله بن العباس بن عبدالمطلب وشهد بن حوشب، حدیث: ۲۸۵۴

۱۳۲- ابو القاسم عبدالرحمان بن عبداللہ سہیلی، **التعريف والأعلام فيما أبهم من الأسماء والأعلام في القرآن الكريم**، ص۲۰

۱۳۳- عبدالرحیم، **المعرب**، ص ۱۰۷

کے بجائے ہمزہ کی موجودگی اس بات کی غماز ہے کہ یہ سریانی سے عربی میں درآیا ہے، اس لیے کہ سریانی میں اس کا اِملا اِسرائیل ہے۔

الأَسْفَارُ

﴿ مَثَلُ ٱلَّذِينَ حُمِّلُواْ ٱلتَّوۡرَىٰةَ ثُمَّ لَمۡ يَحۡمِلُوهَا كَمَثَلِ ٱلۡحِمَارِ يَحۡمِلُ أَسۡفَارَۢاۚ ﴾[۱۳۴] (اُن لوگوں کی تمثیل جن پر تورات لادی گئی پھر انھوں نے اِس کو نہ اُٹھایا اُس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہو۔) ابن ابی حاتم ضحاک کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:"أَسْفَارٌ کے معنی نبطی زبان میں کتابوں کے ہیں۔"[۱۳۵] کرمانی لکھتے ہیں:"جمعُ سِفْرٍ، وهو الكتابُ يكشف عن المعنى كماتسفرالمرأة وجهها وهو نَبَطِيٌّ، وهو قول الضحاک."[۱۳۶] (أَسْفَارٌ، سِفْرٌ کی جمع ہے۔کتاب کو کہاجاتا ہے اس لیے کہ وہ مطالب ومعانی اور حقائق کو ظاہر کرتی ہے جیسا کہ عورت اپنا چہرہ ظاہر (کر کے اپنا حسن وجمال ظاہر) کرتی ہے۔ضحاک کہتے ہیں کہ یہ نبطی زبان کا لفظ ہے۔) سیوطی نے واسطی کی کتاب **الإرشاد** کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ سریانی زبان میں کتاب کو کہاجاتا ہے۔[۱۳۷]

اس آیت نے یہود کے پندار پر ضرب لگائی ہے کہ اگر وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ کتاب وشریعت کے حامل وہی ہوسکتے ہیں، کوئی دوسرا اس شرف میں اُن کا حریف نہیں ہوسکتا، تو یہ گھمنڈ اب وہ اپنے دماغ سے نکال دیں۔اب اُن کی مثال اُس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ تو اُٹھائے ہوئے ہے لیکن اُسے کچھ خبر نہیں کہ اِن کتابوں میں کیا ہے۔

﴿ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا ﴾ یعنی اس میں تو شبہ نہیں کہ ایک زمانے میں ان کے اوپر تورات کا بوجھ لادا گیا، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ انھوں نے اِس بارِ گراں کو اُٹھایا نہیں، اس نہ اُٹھانے کی

۱۳۴- الجمعة: ۵

۱۳۵- ابن ابی حاتم،تفسیر ابن أبي حاتم، ج۱۰، ص۳۳۵۵

۱۳۶- محمود بن حمزہ کرمانی،غرائب التفسير و عجائب التأويل،ت: شمران سرکال یونس عجلی، جدہ، دار القبلة للثقافة العربية،۱۴۰۸ھ-۱۹۸۸ء، ج۲، ص۱۲۱۱

۱۳۷- سیوطی، الإتقان،ج۱، ص۱۸۰؛ المهذب، ص۳۹

وَضاحت كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللهِ کے اَلفاظ سے فرمادی گئی کہ تورات کی تعلیمات اوراس کے احکام پر ان کا ایمان باقی نہیں، عملاً انھوں نے اُن کی تکذیب کر دی۔ ظاہر ہے کہ جب ان کتابوں کے احکام کی انھوں نے تکذیب کر دی تو اُن کے اجر سے تو وہ محروم ہو گئے، صرف اُن کا گناہ اُن کے سر پر باقی رہا اور وہ اس مثل کے مَصداق ہیں کہ

چارپائے بر و کتابے چند

إسماعيل علیہ السلام

جوالیقی لکھتے ہیں: "وإسمٰعيل فيه لغتان: إِسمٰعيل وإِسمٰعينُ." [۱۳۸] (اس میں دو لغتیں ہیں: اسماعیل اور اسماعین۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "وإسمٰعين- بالنون- هي اللغةُ الجاريةُ على أَلْسِنة أهل مصر الأن." [۱۳۹] (اہل مصر کے ہاں اسماعین آج کل زبان زد ہے۔) خفاجی لکھتے ہیں: "قال السبكي أن معناهُ: عطيَّةُ الله، وقال صاحب **القاموس** إنَّ معناهُ: مُطيعُ الله، وليساصحيحين." [۱۴۰] (سبکی نے کہا ہے کہ اس کے معنی عطیۃ اللہ کے ہیں، صاحب قاموس (مجد الدین فیروزآبادی) [۱۴۱] نے کہا ہے کہ اس کے معنی، مطیع اللہ ہیں، مگر یہ دونوں قول نادرست ہیں۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "أصله يِشمَع إيل، وهو مكونٌ من يشمع أي: يسمع، وإيل: الله" [۱۴۲] (اس کی اصل يِشْمَعْ اِيْل ہے، يِشمَع کے معنی سننے اور فرمان برداری کرنے کے ہیں، جب کہ أيْل کے معنی اللہ کے ہیں۔) جوالیقی نے لکھا ہے کہ اس کی اصل

۱۳۸- جوالیقی، المعرب، ص ۱۰۵

۱۳۹- عبدالرحیم، المعرب، ص ۱۰۵

۱۴۰- شہاب الدین احمد بن محمد بن عمر خفاجی، **شفاء الغليل فيما في كلام العرب من الدخيل**، بیروت، دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۱۸ھ - ۱۹۹۸ء، ص ۳۳

۱۴۱- **القاموس المحيط**، بہ ذیل: فصل السين

۱۴۲- عبدالرحیم، المعرب، ص ۱۰۵

أشماویل ہے۔[۱۴۳] مگر ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: یہ قول صحیح نہیں، یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے، جس میں عین کے بعد ہمزہ ہے... اور عربی میں یہ لفظ سریانی کے راستے داخل ہوا ہے۔[۱۴۴]

اِصْرِیْ

قرآن مجید میں وارِد ہے: ﴿ قَالَ ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِى ﴾[۱۴۵] (پوچھا کہ بھلا تم نے اِقرار کیا اور اس اِقرار پر میرا ذمہ لیا (یعنی: مجھے ضامن ٹھہرایا)۔)

ابن جریر نے إصري کا ایک معنی عَهْدِي کیا ہے۔[۱۴۶] سیوطی لکھتے ہیں کہ:"قال أبو القاسم في **لغات القرآن**: معناهُ عهدي، بالنبطية."[۱۴۷] (ابو القاسم نے **لغات القرآن** میں کہا ہے کہ نبطی زبان میں اِصْرٌ عہد کے معنی میں ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں:"یہ نبطی لفظ ہے۔"[۱۴۸]

أَكْوَابٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ يُطَافُ عَلَيْهِم بِصِحَافٍ مِّن ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ ﴾[۱۴۹] (اُن پر سونے کی پرچوں اور پیالوں کا دور چلے گا۔) اَکْوَابٌ، کُوبٌ جمع ہے، اور اس سے مراد ایسا پیالہ ہے جس کا دستہ نہ ہو۔ مفسر ابن جریر نے ضحاک کے حوالے سے لکھا ہے کہ:"الأكوابُ جرار ليست لها عُرىً، وهي بالنبطية كوبا."[۱۵۰] (اَکواب ایسے پیالے ہیں جن کے دستے نہ ہوں، نبطی میں اسے کوبا کہتے ہیں۔) ابن جوزی نے اس

۱۴۳- جوالیقی، **المعرب**، ص۹۵

۱۴۴- عبدالرحیم، مرجعِ سابق، ص۱۰۵

۱۴۵- اٰل عمران : ۸۱

۱۴۶- ابن جریر، **تفسیر الطبري**، ج۳، ص۳۳۲

۱۴۷- سیوطی، **الإتقان**، ج۱، ص۱۸۰؛ **المهذب**، ص۴۰

۱۴۸- تونجی، **المعرب والدخیل**، ص۱۹۳

۱۴۹- الزخرف: ۷۱

۱۵۰- ابن جریر، مصدرِ سابق، ج۱۱، ص۶۳۰

کی اصل نبطی زبان کی اَکواز تسلیم کیاہے۔[۱۵۱] ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "واحدها كوبٌ، وهوالكوز المستدير الرأس، لاعُروةَ له، فارسيةٌ." [۱۵۲] (اس کاواحد کوب ہے، اُس بے دست کوزے کو کہاجاتاہے، جس کاسراگول ہو، یہ فارسی لفظ ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں:"واختلفوا في أصلها فمن هم مَن رآهايونانية من Kybos، أولاتينية من Kupa."[۱۵۳] (اس کے اصل کے بارے میں محققین کے مابین اختلاف ہے۔بعض کاخیال ہے کہ یونانی زبان میں اس کی اصلKybos ہے جب کہ بعض کے نزدیک یہ لاطینی زبان کےKupa سے ماخوذ ہے۔)

أَلِيْمٌ

ابن جوزی لکھتے ہیں کہ اَلَمٌ سے ماخوذ یہ لفظ درد کے معنی میں مستعمل ہے، جوزنج سے زبان سے تعلق رکھتاہے۔[۱۵۴] سیوطی نے بھی ابن جوزی کے حوالے سے یہ بات لکھ کر شیدلۃ کے حوالے سے اسے عبرانی زبان سے ماخوذ تسلیم کیاہے۔[۱۵۵] ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں:"وَنُرَجِّحُ عربيتها."[۱۵۶] (ہمارے نزدیک اس کاعربی ہونا راجح ہے۔)

الإلُّ

امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں: "الإلُّ هوالله عزوجل، وعن أبي بكر الصديق رضی اللہ عنہ أنه لما سمع هذيان مسيلمة قال: إنَّ هذا الكلام لم يخرج من اِلٍّ."[۱۵۷] (یہ اللہ عزوجل کا نام ہے۔سیدنا

۱۵۱- ابن جوزی، **فنون الأفنان**، ص۱۱۷؛ سیوطی،**الإتقان**، ج۱،ص ۱۸۰

۱۵۲- تونجی، **المعرب والدخیل**،ص۱۹۳

۱۵۳ - تونجی، نفس مرجع،ص۲۰۳

۱۵۴- ابن جوزی،**فنون الأفنان**،ص ۱۱۸

۱۵۵- سیوطی، مرجع سابق، ج۱،ص۱۸۰؛ **المهذب**،ص۴۰

۱۵۶- تونجی، مرجع سابق،ص۱۹۳

۱۵۷- فخرالدین رازی، **التفسير الكبير**، بیروت، دار إحيا التراث العربي، ۱۴۱۷ھ- ۱۹۹۷ء،ج۵،ص۵۳۲

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب مسیلمہ کذاب کا ہذیان آپ کے گوش گزار ہوا تو فرمایا: یہ کلام اللہ تعالیٰ سے سرزد نہیں۔) اور یہ مجاہد کی رائے بھی ہے: "الإلُّ هو الله تعالى، قال مجاهد في قوله سبحانه: ﴿ لَا يَرْقُبُونَ فِي مُؤْمِنٍ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ﴾[۱۵۸] لیکن:"وطعن الزجاج في هذا القول وقال: أسماء الله معلومةٌ من الأخبار والقرآن، ولم يسمع أحد يقول:ياإلُّ." [۱۵۹] (زجاج نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسما قرآن مجید اور احادیث نبویہ کے ذریعہ معلوم ہیں، جن میں یہ نام مذکور نہیں، نیز ہم نے کسی شخص کو یا اِلُّ کہتے نہیں سنا گیا۔) امام رازی نے ازہری کے حوالے سے لکھا ہے: " أيل من أسماء الله عزوجل بالعبرانية، فجائز أن يكون عُرِّبَ."[۱۶۰] (عبرانی زبان میں "ایل" اسماے الٰہیہ میں سے ہے، اس لیے اس کا معرب ہونا درست ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الإلُّ:الله تُعالى، عبريةٌ ونبطيةٌ، و EL: الله في معظم الساميات"۔[۱۶۱] (عبری اور نبطی زبان میں اللہ تعالیٰ کے لیے الإلُّ استعمال کیا جاتا ہے اور اکثر سامی زبانوں میں EL، اللہ تعالیٰ کے لیے مستعمل ہے۔)

إنْجِيل

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کا نام ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں بارہ مقامات پر کیا گیا ہے: سورة آل عمران: ۳، ۴۸، ۶۵؛ سورة المائدة: ۴۶، ۴۷، ۶۶، ۶۸، ۱۱۰؛ سورة الأعراف: ۱۵۷؛ سورة التوبة: ۱۱۱؛ سورة الفتح: ۲۹؛ سورة الحديد: ۲۷۔ جوالیقی لکھتے ہیں:

والإنجيل أعجمي معرب،وقال بعضهم:إن كان عربيًّا فاشتقاقه من النَّجْلِ، وهو ظُهورالماء على وجه الأرض واتساعه،ونَجَلْتُ الشيء: إذااستخرجتَه وأظهرتَه، فالإنجيلُ مستخرجٌ به علوم و حكم،وقيل:هوإفعيل، من النَّجْلِ، وهوالأصل، فالإنجيلُ أصل لعلومٍ وحِكَمٍ.[۱۶۲]

۱۵۸- التوبة:۱۰؛ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ،**تأويل مشكل القرآن**، قاہرہ،دارالتراث،۱۳۹۳ھ- ۱۹۷۲ء،ص۴۴۹

۱۵۹- رازی،مصدرِ سابق،ج۵،ص۵۳۲

۱۶۰- رازی،مصدرِ سابق، ج۵،ص۵۳۲

۱۶۱- تونجی،مرجعِ سابق،ص۱۹۳

۱۶۲ - جوالیقی، **المعرب**،ص۱۲۳

انجیل عجمی اور معرب ہے۔ بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ عربی ہونے کی صورت میں اس کا اشتقاق النَّجْلُ سے ہے، جس کے معنی روئے زمین پر پانی ظاہر ہو جانے اور اس کے پھیلنے کے ہیں اور نَجَلْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ علم و حکمت کا خزانہ اور اس کی اصل و اَساس ہونے کی بِنا پر یہ آسمانی کتاب انجیل کہلاتی ہے۔

ابن فارِس کہتے ہیں: "والإنجيلُ: هذا الكتابُ، قيل: هو من نَجَلْتُ، أي: استخرجتُ"[۱۶۳] (انجیل، نَجَلْتُ الشَّيءَ سے ہے، جس کے معنی ہیں: میں نے اسے نکال لیا، یعنی واضح کر دیا۔) ابن سیدہ اور ابن منظور افریقی نے قِيْلَ کہہ کر اس کا اشتقاق نجل سے مان کر اس کے معنی اصل کے کیے ہیں۔[۱۶۴] ابن منظور نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ عبرانی یا سریانی کا لفظ ہے۔[۱۶۵] ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "هو يوناني... ومعناه اللغوي:البُشرٰى، ومنه بالإيطالية Evangelio وبالألمانية: Evanglium"[۱۶۶] (یہ یونانی لفظ وَنْجِلْيُوْنُ کا معرب ہے، جو اِٹالین زبان میں Evangelio اور المانی میں Evanglium ہے۔)

بعض کا خیال ہے کہ انجیل عربی زبان کا لفظ ہے۔ زمخشری نے ان کے جواب میں لکھا ہے: "إسمان أعجميانِ، وتُكُلِّفَ اشتقاقهما من الوري والنَّجْلِ، ووزنهما بتفعلة وأفعيل إنما يصحُّ بعد كونهما عربيين، وقرأالحسن:الْاَنجيل، بفتح الهمزة، وهودليلٌ على العُجمهِ، لأنَّ أفعيل- بفتح الهمزة- عديمٌ في أوزان العرب."[۱۶۷] (تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں۔ تکلف سے کام لے کر ان کا اِشتقاق وَرْيٌ اور نَجْلٌ سے بتانا اور ان کا وزن تَفْعِلَةٌ اور اِفْعِيْلٌ بیان کرنا اُس وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ یہ دونوں لفظ عربی ہوں۔ حسن بصری نے اس کی قراءت اَنْجِيْلٌ کی ہے جس میں فتحہ

۱۶۳- ابن فارس، **مجمل اللغة**، كتاب النون، باب النون والجيم وما شلشهما

۱۶۴- ابن سیدہ، **المحكم والمحيط الأعظم**، حرف الجيم، الجيم و اللام و النون، مقلوبة : ن ج ل؛ ابن منظور افریقی، **لسان العرب**، بہ ذیل: "ل"، فصل النون، ج۱۴، ص۵۸

۱۶۵- ابن منظور افریقی، نفس مصدر و مادہ

۱۶۶- جوالیقی، مرجع سابق، ص۱۲۴

۱۶۷- زمخشری، **الكشاف**، ج۱، ص۳۳۵-۳۳۶

کو ہمزہ ہے یہ اس کے عجمی ہونے کی دلیل ہے کیوں کہ اَفْعِیْلٌ کا فتح ہمزہ کے ساتھ سرے سے اَوزانِ عرب میں وجود ہی نہیں ہے۔)

اَوَّابٌ

ابن حاتم نے سیدنا عمرو بن شرحبیل کے حوالے سے لکھا ہے کہ حبشی زبان میں اس کے معنی اَلْمُسَبِّحُ (تسبیح بیان کرنے والے) کے ہیں۔[۱۶۸] ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الأوَّابُ، المُسَبِّحُ بلسان الحبشةِ۔ أومن الأوَّابِ."[۱۶۹] (الأوَّابُ: حبشی زبان میں اس کے معنی تسبیح پڑھنے والے کے ہیں۔) قرآن مجید میں سیدنا داؤد، سیدنا سلیمان اور سیدنا ایوب علیہم السلام کے حق میں اَوَّابٌ استعمال کیا گیا ہے۔[۱۷۰] عربی ہونے کی صورت میں اس کا مصدر اَوْبٌ ہو گا جس کے معنی بار بار رجوع کرنے کے ہیں۔ اکثر مفسرین اسے معرب اور دخیل نہیں تسلیم کرتے۔ راغب لکھتے ہیں: "الأوبُ ضربٌ من الرجوعِ، وذلک أنَّ الأوَّابَ لایُقالُ إلاَّ في الحیوان الذي له إرادةٌ، والرُّجوعُ یقالُ فیه وفي غیره."[۱۷۱] (الأوْبُ کے معنی رجوع ہونے کے ہیں لیکن رجوع کا لفظ عام ہے جو حیوان اور غیر حیوان دونوں کے لوٹنے پر بولا جاتا ہے مگر اَوَّابٌ کا لفظ خاص کر حیوان کے ارادتاً لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔) ابن جریر لکھتے ہیں: "الأوَّابُ:التوَّابُ الذي یَئُوبُ إلی طاعةِ الله ویرجِعُ إلیها، وذلک الأوَّابُ، والأوَّابُ:المُطیعُ." [۱۷۲] (الأوَّابُ وہ ہے جو بہ کثرت اللہ تعالیٰ اور اس کی اطاعت کی طرف رجوع کرتا ہے، یہ مطیع اور فرمان بردار کے لیے بھی مستعمل ہے۔) حدیث میں ہے کہ:

۱۶۸- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن أبي حاتم، ج ۱۰، ص ۳۲۳۷

۱۶۹- تونجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۳

۱۷۰- سورۃ ص: ۱۷، ۳۰، ۴۴

۱۷۱- راغب اصفہانی، المفردات، ص ۳۰

۱۷۲- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج ۱۰، ص ۵۶۲؛ روایت، ص ۲۹۸۸۰

"لایُحافِظ علی صلاة الضُّحی إلاَّ أوَّابٌ قال:وهي صلاة الأوَّابین"[۱۷۳] (چاشت کی نماز کی محافظت اَوَّابْ ہی کرے گا، اور یہی اَوَّابِیْن کی نماز ہے۔) یہ بھی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: "صلاة الأوَّابین حین ترمض الفصال، وفي روایةٍ: صلاة الأوابین إذارمضت الفصال."[۱۷۴] (اوابین کی نماز اس وقت ہے جب اونٹوں کے بچوں کے پاؤں ریت میں گرم ہونے لگتے ہیں۔) ہروی (وفات:۴۰۱ھ) اور ابن اثیر (وفات:۶۰۶ھ) لکھتے ہیں:"وهي أن تَحْمَی الرَّمْضاء، وهي الرمل، فتَبْرک الفصال من شدة حرها، وإحراقها أخفافها."[۱۷۵] (یہ نماز اس وقت پڑھی جاتی ہے جب ریت گرم ہو جاتی ہے اور اس تپتی ریت میں اونٹ کے بچے شدت گرمی اور پاؤں کے گرم ہونے کی وجہ سے بیٹھ جاتے ہیں۔)

امام نووی لکھتے ہیں:

والرمضاء: الرمل الذي اشتدت حرارته بالشمس، أي:حین تحترق أخفاف الفصال، وهي الصِّغارمن أولاد الإبل، جمع فصیل، من شدة حرالرمل، والأوَّابُ المطیع، وقیل:الراجع إلی الطاعة، وفیه فضیلة الصلاة هذاالوقت، قال أصحابنا:هوأفضل وقت صلاة الضحی، وإن کانت تجوزمن طلوع الشمس إلی الزوال.[۱۷۶]

رَمضاء شدید گرم ریت کو کہا جاتا ہے اور فصال، فَصِیل کی جمع ہے۔ اونٹ کے چھوٹے بچے کو کہا جاتا ہے۔اَوَّاب کے معنی مطیع و فرمان بردار کے ہیں، یہ چاشت کی نماز کا دوسرا نام ہے، مگر اتنی دیر تک اس میں تاخیر کرنا مستحب ہے جس وقت اونٹ کے بچے شدت گرمی کے سبب چرنے سے بیٹھ جاتے ہیں۔

۱۷۳- نیسابوری، **المستدرک**، ج۱، ص۳۱۴

۱۷۴- صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین وقصرها، باب صلاة الأوابین حین ترمض لفصال، حدیث: ۱۴۳،۱۴۴

۱۷۵- ہروی، **الغریبین**، ج۳، ص۷۷۸، ابن اثیر جوزی، **النهایة في غریب الحدیث و الأثر**، مادہ: ر م ض

۱۷۶- ابوزکریا یحیی بن شرف نووی، **شرح صحیح مسلم**، دمشق، مکتبة الغزالي، بدون تاریخ، ج۶، ص۳۰

شیخ عبد القادر جیلانی لکھتے ہیں: "فصلاة الضحى هي صلاة الأوّابين."[۱۷۷] (پس صلاۃِ اوابین چاشت کی نماز کا دوسرا نام ہے۔) اور اس کا افضل ترین وقت زوال سے تھوڑا آگے ہے اور یہی وہ وقت ہے جس میں اونٹوں کے بچے گرم ریت میں شدت گرمی کے باعث چرنا چھوڑ دیتے ہیں۔

اَوَّاہٌ

ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے مجاہد اور عکرمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے اور مُوْقِنٌ (یقین رکھنے والا/مؤمن) کے معنوں میں مستعمل ہے۔[۱۷۸] سیدنا عمرو بن شرحبیل[۱۷۹] سے اس کا معنی "رحیم" منقول ہے۔[۱۸۰] قرآن مجید میں دو جگہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ: ﴿ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَأَوَّٰهٌ حَلِيمٌ ﴾[۱۸۱] ﴿ إِنَّ إِبْرَٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّٰهٌ مُّنِيبٌ ﴾[۱۸۲]

اَوَّاہٌ کے معنی كَثِيْرُ التَّأَوُّه، یعنی دردمند، غم خوار اور رقیق القلب کے ہیں اور حَلِيْمٌ کے معنی بُردبار کے ہیں۔ ان الفاظ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی تعریف اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اُن کے باپ کے معاملے میں دردمندی اور بردباری بہت پسند آئی۔ آزر نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نہایت سنگ دلانہ برتاؤ کیا تھا لیکن سعادت مند بیٹے نے حلم و بردباری سے نہ صرف باپ کی جھڑکی اور دھمکی برداشت کی، بلکہ غایتِ دردمندی کے ساتھ اُس کے لیے دعاو استغفار کا وعدہ بھی کر لیا۔

۱۷۷- عبد القادر جیلانی، **الغنية لطالبي طريق الحق**، ت: محمد خالد عمر، بیروت، دار إحياء التراث العربي، ۱۴۱۶ھ-۱۹۹۶ء، ج۲، ص۹۵

۱۷۸- ابن ابی حاتم، **تفسیر ابن أبي حاتم**، ج۶، ص۱۸۹۶؛ ابن جریر، **تفسیر ابن جریر**، ج۶، ص۴۹۶

۱۷۹- آپ صحابی ہیں، ابن عبد البر لکھتے ہیں کہ مجھے ان کے نسب نامے سے کوئی واقفیت نہیں، البتہ یہ بات طے ہے کہ آپ عمرو بن شرحبیل ہمدانی صاحبُ سیدنا ابن مسعود نہیں ہیں۔ (ابن عبد البر، **الاستيعاب في معرفة الأصحاب**، بیروت، دار الجیل، ج۳، ص۱۱۸۴)

۱۸۰- ابن جریر، مصدرِ سابق، ج۶، ص۴۹۶

۱۸۱- التوبة: ۱۱۴

۱۸۲- هود: ۷۵

الأُوْلٰی

پہلی، اگلی، عربی ہونے کی صورت میں أَوَّلُ کا مؤنث۔ زرکشی، سیوطی اور تونجی لکھتے ہیں:"والقبط يسمون الأخرة الأولى، والأولى:الأخرة"[۱۸۳] (قبطی میں الأخِرَةُ کوالأُوْلٰی کے معنی میں اور الأولٰی کو الأخرة کے معنی میں لیتے ہیں۔)﴿ مَا سَمِعْنَا بِهَٰذَا فِي ٱلْمِلَّةِ ٱلْأَخِرَةِ ﴾[۱۸۴] (ہم نے تو یہ بات پچھلے مذہب میں نہیں سنی۔)

بُرْهَانٌ

ڈاکٹر تونجی لکھتے ہیں:"الكلمةُ حبشيةٌ، مشتقةٌ عندهم من"بَرَه":اتَّضَحَ وأَنَارَ، وأضاف بلعربُ عليها نونا واشتقوامنها."[۱۸۵](بنیادی طور پر یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ بَرَه سے مشتق ہے، جس کے معنی واضح اور ظاہر ہونے کے ہیں۔ عربوں نے اس میں نون کا اضافہ کیا اور اسے مصدر بنا کر اس سے اشتقاق کیا۔)

راغب نے اسے "بَرَه" کے ذیل میں لکھ کر فرمایا ہے:

البُرهانُ کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں اور یہ رُجْحَان اور ثُنْيَان کی طرح فُعْلاَن کے وزن پر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بَرِهَ يَبْرَهُ کا مصدر ہے جس کے معنی سفید اور چمکنے کے ہیں۔ صفت اَبْرَه، اَلْبَرَهُ: گورے پن کے ساتھ گدازیِ بدن، اَلْبَرَهْرَهَةُ: سفید نوجوان حسینہ، جو حسن ونزاکت کی وجہ سے لچکتی ہو، رنگ کی صفائی کے باعث جس کی جلد چمک رہی ہو، تنعم وآسودگی کی وجہ سے جو تروتازہ ہو۔ اَلْبُرْهَةُ: وقت کا کچھ حصہ اور بُرْهَان دلیلِ قاطع کو کہتے ہیں جو تمام دلائل سے زوردار ہو اور ہر حال میں ہمیشہ سچی ہو۔) قرآن مجید میں ہے:﴿ قُلْ هَاتُوا۟ بُرْهَٰنَكُمْ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴾[۱۸۶] (کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔)[۱۸۷]

۱۸۳- زرکشی،البرهان، ج۱،ص ۲۸۸،سیوطی، الإتقان، ج۱،ص ۱۸۰، تونجی، المعرب والدخيل،ص۱۹۱

۱۸۴- ص: ۷

۱۸۵- تونجی، مرجع سابق،ص۱۹۳

۱۸۶- البقرة: ۱۱۱

۱۸۷- راغب اصفہانی، المفردات،ص۴۵

بَطَائِنُهَا

"بَطَائِنُهَا: ظواهرها، بالقبطية."[۱۸۸] (قبطی زبان میں بَطَائِنُهَا کے معنی ظواهرها (اس کا ظاہر) کے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "قبطی زبان میں اس کے معنی ظواهرها کے ہیں اور اگر اسے البطن کا مقابل قرار دیا جائے تو پھر یہ عربی ہے۔" [۱۸۹] قرآن مجید میں ہے: ﴿ مُتَّكِـِٔينَ عَلَىٰ فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ ﴾[۱۹۰] (وہ ٹیک لگائے ایسے بچھونوں پر بیٹھے ہوں گے جن کے استر استبرق کے ہوں گے۔)

بَعِيْرٌ

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "البعيرُ: الدابة الذي يحمل الأحمال أو يجر العربة، قيل: هي عبرية وقيل: آرامية."[۱۹۱] (البعیرُ اُس جانور کے لیے بولا جاتا ہے جس پر بوجھ لادا جائے، باربرداری کا جانور، بتایا گیا ہے کہ یہ عبرانی یا آرامی زبان کا لفظ ہے۔) ابن جریر نے مجاہد کے حوالے سے ﴿ وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيرٍ ﴾[۱۹۲] کے تحت لکھا ہے: "حِمل حمارٍ، قال هي لغةٌ، وقال القاسم: يعني مجاهد: أنَّ الحمارَ يقال له في بعض اللغاتِ بعيرٌ."[۱۹۳] (گدھے کا بار، یہ بھی ایک لغت ہے۔ قاسم نے فرمایا ہے کہ مجاہد کا مطلب یہ ہے کہ بعض لغات میں گدھے کے لیے بَعِيْرٌ مستعمل ہے۔) ابن عطیہ بھی مجاہد کے حوالے سے لکھتے ہیں: "أرادَ كيلَ حمارٍ، قال: وبعض العربِ يقول للحمار بعيرٌ، وهذا شاذٌ."[۱۹۴] (مراد گدھے کا بار ہے۔ بعض عرب گدھے کو بَعِيْرٌ کہتے ہیں، لیکن یہ (قول) شاذ ہے۔)

۱۸۸- زرکشی، **البرهان في علوم القرآن**، ج۱، ص۲۸۹

۱۸۹- تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۴

۱۹۰- الرحمن: ۵۴

۱۹۱- تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۴

۱۹۲- یوسف: ۶۵

۱۹۳- ابن جریر، **تفسیر ابن جریر**، ج ۷، ص ۲۴۷

۱۹۴- ابن عطیہ، **المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز**، ت: عبدالسلام عبدالشافی، بیروت، دارالکتب العلمیة، ۲۰۱۱ء، ج۳، ص۲۶۱

مرتضیٰ سبزی لکھتے ہیں:

سیدنا داؤد عَلَيْهِ السَّلَام کے زبور میں ہر بار برداری کرنے جانور کے لیے بعیر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور عبرانی زبان میں بھی ایسا ہی ہے۔ ان دونوں لغتوں کو ابن خالویہ نے ذکر کیا ہے۔ ابن بری کہتے ہیں: بعیر کے بارے میں ابن خالویہ اور متنبی کے مابین سیف الدولہ بن حمدان کی مجلس میں ایک سوال و جواب کا تبادلہ ہوا ہے، جس میں سائل ابن خالویہ تھے۔ ابن خالویہ نے کہا کہ گدھے کے لیے بَعِيْرٌ کا استعمال بھی کیا جاتا ہے، جو ایک نادر لغت ہے، میں نے اسے متنبی کے سامنے بیان کیا۔ متنبی جو مغرور و متکبر اور بداَخلاق تھا، کھسیانا سا ہو گیا تو میں نے کہا کہ ﴿وَلِمَن جَآءَ بِهِۦ حِمۡلُ بَعِيرٍ﴾[195] میں بَعِيْرٌ سے مراد گدھا ہے، اس لیے کہ سیدنا یعقوب عَلَيْهِ السَّلَام اور برادرانِ یوسف کی رہائش کنعان میں تھی جہاں آمد و رفت اور بار برداری کے کام گدھوں سے لیے جاتے تھے اور جہاں اونٹ نہیں تھے۔ یہ بات مقاتل بن سلیمان نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے۔[196]

بِيَعٌ

بِيَعٌ: عبادت خانے، بِيْعَةٌ کی جمع ہے، جس کے معنی یہود و نصاریٰ کے عبادت خانہ اور گرجا کے ہیں۔

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "البِيعةُ: الكنيسةُ، والكلمة آراميةٌ أصلها، ومعناها البيضة، والأراميون يلفظون الضاد عينًا، وهي اسم لِمَعبدِ النَّصَارىٰ واليهود."[197] (کنیسہ کو بِيْعَةٌ کہتے ہیں۔ اصل میں یہ آرامی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی بِيْضَةٌ (انڈے) کے ہیں۔ آرامی لوگ ضاد کی جگہ عین پڑھتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے عبادت خانے کو کہا جاتا ہے۔) جوالیقی لکھتے ہیں: "والبِيعَةُ والكنيسةُ جعل هما بعض العلماء فارسيينِ معَرَّبَينْ."[198] (بِيْعَةُ اور كَنِيْسَةُ کو بعض علما نے فارسی سے معرب جانا ہے۔)

۱۹۵- یوسف: ۷۲

۱۹۶- زبیدی، تاج العروس، مادہ: بعر

۱۹۷- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۴

۱۹۸- جوالیقی، المعرب، ص ۲۰۷

ڈاکٹر عبد الرحیم نے کنیسہ کے بارے میں لکھا ہے کہ اسے فارسی میں کُنِشْت کہا جاتا ہے، جو فارسی میں آرامی زبان سے در آیا ہے، جو اصل میں کنوشتا ہے، جب کہ عربی زبان میں كنيسة. کلدانی زبان سے آیا جو اصل میں كَنِيْشَةٌ ہے۔[۱۹۹]

تَتْبِيْرٌ

ہلاک کرنا، ویران کرنا، بروزنِ تَفْعِيْلٌ مصدر ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيرًا ﴾[۲۰۰] (تاکہ جس چیز پر اُن کا زور چلے اُسے تہس نہس کر ڈالیں۔) ابن ابی حاتم لکھتے ہیں: "تَبَّرْنَا: دَمَّرْنَا، بالنبطية"[۲۰۱] (تَبَّرْنَا کے معنی دَمَّرْنَا کے ہیں اور یہ نبطی زبان کا لفظ ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "والكلمة نبطيةٌ أصلهاآراميٌّ، ومن الطريف أنَّ تَبَرَ بالفارسية بمعنى الفأس الذي تكسَّربه الأشجار."[۲۰۲] (تَتْبِيْرٌ نبطی کلمہ ہے، جو آرامی الاصل ہے۔ یہ عجیب لطیفہ ہے کہ فارسی زبان میں تَبَرْ، درخت کاٹنے والے کلہاڑی کو کہا جاتا ہے۔)

تَحْتٌ

شیخ محمود بن حمزہ کرمانی نے ﴿ فَنَادَىٰهَا مِن تَحْتِهَآ ﴾[۲۰۳] کے تحت لکھا ہے: "الغريب ؤ رج: مِنْ تَحْتِهَا، أي: من بطنها-بالنبطية-وهوبعيدٌ."[۲۰۴] (مِنْ تَحْتِهَا کا ایک نہایت ضعیف معنیٰ مؤرج سدوسی سیمِنْ بَطْنِهَا (اُس کے پیٹ میں سے) کے نقل ہیں، جو نبطی زبان کا لفظ ہے، لیکن یہ معنی بعید ہے۔)

۱۹۹- جوالیقی، نفسِ مصدر، ص۲۰۸

۲۰۰- بني اسرائيل: ۷

۲۰۱- ابن ابی حاتم، مرجعِ سابق، ج۷، ص۲۳۱۸

۲۰۲- ڈاکٹر تونجی، مرجعِ سابق، ص۱۹۴

۲۰۳- مریم: ۲۴

۲۰۴- رازی، **عجائب القرآن**، ج۱، ص۶۹۲

تَنُّوْرٌ

تَنُّوْرٌ کے بارے میں علما کے دو قول ہیں:

۱- یہ فارسی سے عربی میں داخل ہوا ہے۔ ابن درید، جوالیقی اور ابن جوزی کی یہی رائے ہے۔[۲۰۵]

۲- ابن قتیبہ نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے: "التَّنُّوْرُ بكل لسانٍ، عربيٍ و عجميٍ."[۲۰۶] (عربی اور عجمی ساری زبانوں میں تنور مستعمل ہے۔)

ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "اسے عبرانی میں تنور پڑھا جاتا ہے، جب کہ آرامی اور سریانی زبانوں میں تنوراہے۔ ابستاقیہ اور پہلوی میں Tanura ہے۔"[۲۰۷] ڈاکٹر عبدالرحیم یہ بھی لکھتے ہیں: "وفي الأردية تَنْدُور بقلبِ إحدَى النُّونين دالًا، وهومحرَّفٌ من الكلمة العربية."[۲۰۸] (اردو میں تندور عربی کلمہ میں تحریف کر کے بنایا گیا ہے۔ (عربی کے تَنُّور: ت،ن،ن،و،ر) میں ایک نون کو دال سے بدل دیا گیا ہے۔)

قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَفَارَ ٱلتَّنُّورُ ﴾[۲۰۹] (اور زمین میں سے پانی ابلنا شروع ہوا۔) فَارَ، يَفُوْرُ کے معنی جوش مارنے والے کے ہیں۔ یہ لفظ پکتی ہوئی ہانڈی کے جوش مارنے اور ابلنے کے لیے بھی آتا ہے اور بھڑکتے ہوئے تنور کے جوش مارنے کے لیے بھی۔ یہاں فَارَالتَّنُّوْرُ کا محاورہ، بہ طریقِ استعارہ اس سائیکلونی طوفانی کی تعبیر کے لیے استعمال ہوا ہے جو قومِ نوح پر آیا جس سے سخت بارش بھی ہوئی اور آس پاس کے سمندروں کا پانی بھی اُبل پڑا۔

۲۰۵- ابو بکر محمد بن الحسن بن درید، **جمهرة اللغة**، باب القاء و الراء مع ما يليسهما الصحيح، مادہ: ت ر و؛ جوالیقی، **المعرب**، ص ۲۱۲؛ ابن جوزی، **فنون الأفنان**، ص ۱۱۶

۲۰۶- ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، **أدب الكاتب**، ص ۳۸۴؛ جوالیقی، مصدرِ سابق، ص ۲۱۳

۲۰۷- عبدالرحیم، مرجعِ سابق، ص ۲۱۴

۲۰۸- عبدالرحیم، مصدرِ سابق، ص ۲۱۴

۲۰۹- هود: ۴۰؛ المؤمنون: ۲۷

تَوْراة

اس آسمانی کتاب کانام ہے جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ یہ معرب ہے اوراس کی تفصیل اس کتاب میں "انجیل" کے تحت کی گئی ہے۔ وہاں ملاحظہ فرمایئے:

التِّیْن

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "یہ آرامی النسل کلمہ ہے۔"[٢١٠] قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَٱلتِّينِ وَٱلزَّيْتُونِ * وَطُورِ سِينِينَ * وَهَٰذَا ٱلْبَلَدِ ٱلْأَمِينِ * ﴾[٢١١] (شاہد ہیں جبلِ تین اور کوہِ زیتون اور طورِ سینین اور یہ پُرامن سرزمین۔)

جَالُوْت

جَالُوْت کا نام قرآن مجید میں دوبار آیا ہے۔[٢١٢] جوالیقی لکھتے ہیں: جالوت: "أعجميٌ، وقد جاءَ في القرآن."[٢١٣] (جالوت عجمی ہے اور قرآن مجید میں آیا ہے۔) راغب اصفہانی لکھتے ہیں: "ذلک أعجمي، لاأصل له في العربية."[٢١٤] (یہ عجمی ہے۔ عربی میں اس کا کوئی اصل نہیں۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں کہ یہ عبرانی زبان کالفظ ہے۔[٢١٥]

٢١٠- تونجی، المعرب والدخیل، ص١٩٤

٢١١- التین: ١-٣

٢١٢- البقرة: ٢٤٩-٢٥٠

٢١٣- جوالیقی، المعرب، ص٢٤٥

٢١٤- راغب اصفہانی، المفردات، ص٩٥

٢١٥- عبدالرحیم، هامش المعرب، ص٢٤٥

جِبْتٌ

ابن ابی حاتم نے سیدناابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے: "الجبتُ: اسم الشيطانِ بالحبشية"[۲۱۶] (حبشی زبان میں شیطان کانام جِبْتٌ ہے۔) ابن جریر اور ابن جوزی نے ابوالعالیہ، ابن زید اور سعید بن جبیر کے حوالے سے لکھا ہے: "الجبتُ: الساحرُ بلسان الحبشة." [۲۱۷] (حبشی زبان میں جِبْتٌ، ساحر کو کہتے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الجبتُ:اسم الشيطان، كما تُطلقُ على الصنم، و الكاهنِ و السَّاحِرِ قيل: هي حبشية."[۲۱۸] (جِبْتٌ، شیطان کا نام ہے اور بت، کاہن اور ساحر کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔)

جُنَاحٌ

گناہ، جُنُوْحٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایک طرف مائل ہونے کے ہیں، اس لیے وہ گناہ جو انسان کو حق سے مائل کردے اور دوسری طرف جھکا دے جُنَاحٌ سے موسوم ہوا اور پھر ہر گناہ کے لیے اس کا استعمال ہونے لگا۔ ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "بمعنى الإثم والذنب، مِن "گناه" الفارسية، وقيل: العكس."[۲۱۹] (جُنَاحٌ، گناہ کے معنی میں مستعمل ہے۔ فارسی کے "گناہ" سے ماخوذ ہے، یہ بھی کہا گیا ہے کہ فارسی والوں نے جُنَاح سے گناہ بنا لیا ہے۔)

جُنْدٌ

لشکر، فوج، جَنَدٌ سے ماخوذ ہے۔ جَنَدٌ اُس سخت زمین کو کہتے ہیں جس میں پتھروں کا ڈھیر ہو، پھر ہر گروہ اور جماعت کو جُنْدٌ کہنے لگے۔ ابن فارس لکھتے ہیں: "اس کے بنیادی معنی اکٹھا ہونے اور مدد کرنے کے

۲۱۶- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن أبي حاتم، ج۳، ص۹۷۴

۲۱۷- ابن جریر، تفسیر ابن جرير، ج۴، ص۱۳۵؛ ابن جوزی، زادالمسير في علم التفسير، ت: عبدالرزاق المهدی، بیروت، دار الكتاب العربي، ۱۴۲۲ھ - ۲۰۰۱ء، ج۱، ص۴۱۹

۲۱۸- ڈاکٹر تونجی، مرجعِ سابق، ص۱۹۴

۲۱۹- ڈاکٹر تونجی، مرجعِ سابق، ص۱۹۵

ہیں۔ مضبوطی اور سختی کی وجہ سے لشکر کو جُنْدٌ کہتے ہیں، اس کی جمع جُنُودٌ آتی ہے اور جمع ہو جانے کے اعتبار سے ہر جماعت اور انصار کو جُنْدٌ کہتے ہیں۔"[۲۲۰]

جَهَنَّم

جوالیقی لکھتے ہیں:"قيل: إنه عربيٌ، ولم يُجْرَللتأنيث والتعريف، وحكي عن رؤبة أنه قال: رَكِيَّةٌ جِهِنَّامٌ: بعيدة القعر."[۲۲۱] (کہا گیا ہے کہ یہ عربی کلمہ ہے اور مؤنث ومعرفہ ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔رؤبہ سے مروی ہے کہ رَكِيَّةٌ جِهِنَّامٌ کے معنی ہیں: گہری تہِ والا کنواں۔) انھوں نے یہ بھی لکھاہے: "جَهَنَّم اسمٌ للنارالتي يعذِّبُ بهاالله في الآخرة، وهي أعجميةٌ، لاتجري للتعريف والعجمة"[۲۲۲] (جہنم اُس آگ کانام ہے جس میں اللہ تعالیٰ (مجرموں کو) آخرت میں عذاب دے گا۔یہ عجمی کلمہ ہے۔معرفہ اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔) ابن جوزی لکھتے ہیں:"وأكثرالنحويين والعلماء على أنَّ جَهَنَّمَ أعجمية."[۲۲۳] (اکثر نحویوں اور علما کے نزدیک جہنم عجمی کلمہ ہے۔) راغب اور جوہری کہتے ہیں: "يُقالُ هوفارسي معربٌ، وهوجِهنامٌ."[۲۲۴] (کہاجاتاہے کہ یہ فارسی سے عربی میں داخل ہواہے، جو اصل میں جِہنام ہے۔) ابن منظورافریقی لکھتے ہیں: "وقيل:هوتعريب كِهِنَّام بالعِبرانية."[۲۲۵] (کہاگیاہے کہ یہ عبرانی زبان کے کِهِنَّام کامعرب ہے۔) ڈاکٹرعبدالرحیم لکھتے ہیں: "والصحيح أنه عِبري، وأصله:

۲۲۰- ابوالحسن احمد بن فارس بن زکریا، **معجم مقاييس اللغة**، باب الجيم و النون وما يثلثهما، مادہ: ج ن د

۲۲۱- جوالیقی، **المعرب**، ص۲۴۹

۲۲۲- جوالیقی، نفس مصدر، ص۲۴۹

۲۲۳- ابن جوزی، **فنون الأفنان**، ص۱۱۶

۲۲۴- راغب اصفہانی، **المفردات**، ص۱۰۲؛ **جوہری**، **الصحاح تاج اللغة و صحاح العربية**، فصل الجيم، مادہ: جهنم، ج۵، ص۱۸۹۲

۲۲۵- ابن منظور، **لسان العرب**، حرف الميم ، فصل الجيم

كِيهِنَّوم وكِهِنَّام."[۲۲۶] (صحیح بات یہ ہے کہ یہ عبرانی کا کلمہ ہے جو اصل میں كِيهِنَّوم یا كِهِنَّام ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الكلمة عبريةٌ، أصلها نِهُّومٌ، وهو اسم وادٍ قرب القدسِ، جعل مزبلة و محرقة."[۲۲۷] (یہ عبرانی کلمہ ہے، جس کی اصل هِنُّومٌ ہے۔ قدس کے قریب ایک وادی کا نام ہے جہاں کوڑا کرکٹ جمع کرکے جلایا جاتا تھا۔)

حِرْم

راغب لکھتے ہیں: "الحرامُ:الممنوع منه إِمَّا بتسخيرٍ إِلٰهيٍّ، وإِمَّا بمنعٍ قهريٍ، وإِمَّا بمنعٍ مِن جهةِ العقلِ أومِن جهةِ الشرعِ أومِن جهةِ مَن يَرْتَسِمُ أمرَهٗ."[۲۲۸] (جس چیز سے منع کر دیا جائے وہ حرام ہے، خواہ بہ تسخیرِ الٰہی ممنوع ہو یا بہ منع قہری یا عقل کی رو سے یا شرع کی طرف سے یا اُس شخص کی وجہ سے جس کا حکم مانا جاتا ہے۔) ﴿ وَحَرَٰمٌ عَلَىٰ قَرۡيَةٍ أَهۡلَكۡنَٰهَآ أَنَّهُمۡ لَا يَرۡجِعُونَ ﴾[۲۲۹] (اور ہم جس بستی کو ہلاک کر دیتے ہیں ناممکن ہے کہ وہ لوگ پھر لوٹ کر آئیں۔) ابن ابی حاتم نے عکرمہ کی سند سے لکھا ہے: "وحِرْمٌ:وَجَبَ، بالحبشية."[۲۳۰] (حبشی زبان میں حِرْمٌ کے معنی لازم ہونے کے ہیں۔) ابن قتیبہ لکھتے ہیں: "أي:حرامٌ عليهم أن يرجعوا، وقيل: حرامٌ: واجبٌ."[۲۳۱] (اُن کا واپس لوٹنا ممکن نہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں حرام کے معنی واجب (لازم) کے ہیں۔)

۲۲۶- ڈاکٹر عبدالرحیم،هامش **المعرب**،ص۲۵۰

۲۲۷- ڈاکٹر تونجی،**المعرب والدخيل**،ص۱۹۵

۲۲۸- راغب اصفہانی،مصدرِ سابق،ص۱۱۴

۲۲۹- الأنبياء: ۹۵

۲۳۰- ابن ابی حاتم، **تفسير ابن أبي حاتم**، ج۸،ص۲۴۶۷

۲۳۱- ابو محمد عبداللہ بن مسلم بن قتیبہ، **تفسير غريب القرآن**، ت:سید احمد صقر، بیروت، دارالكتب العلمية، ۱۹۷۸، ص۲۸۸

ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں :"على قراءة "وحِرْم"حرمٌ:كلمةٌ آراميةٌ بمعنى طرد الكنيسة شخصاًمن شركة المؤمنين."[٢٣٢] (وحِرْم کی قراءت کے مطابق، حِرْم، آرامی زبان کا کلمہ ہے، جس کے معنی ہیں کنیسہ کا کسی شخص کو مؤمنوں کے ساتھ شرکت کرنے کی وجہ سے جلاوطن کرنا۔)

حَصَبٌ

اَلْحَصَبَةُ: کنکری، پتھر، اَلْحَصَبُ:ایندھن، ہر وہ چیز جس سے آگ بھڑکائی جائے۔لکڑی کو بھی اُس وقت حَصَبٌ کہہ سکتے ہیں جب اُس سے آگ کو بھڑکایا اور روشن کیاجائے۔قرآن مجید میں ہے: ﴿ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾[٢٣٣] (تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم اللہ کے سواعبادت کرتے ہو، جہنم کاایندھن ہیں ۔)ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں :"حَصَب:حطبٌ بالحبشية"[٢٣٤](حبشی زبان میں حَصَبٌ کے معنی حَطَبٌ (ایندھن) کے ہیں۔)

حِطَّةٌ

سیوطی حِطَّةٌ کومعرب تسلیم کرتے ہیں۔[٢٣٥] وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ: "وينبغي أن يكون معربًا مصرَّحًا به، ففي **تفسير الأصبهاني** مانصُّهُ: إن هذه اللفظةُ من ألفاظ أهل الكتاب، لايُعرفُ معناها في العربية"[٢٣٦] (یہ صریحی طور پر معرب ہے۔**تفسیر اصبہانی** میں ہے کہ یہ اہل کتاب کی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی عربی زبان میں معلوم نہیں ۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں :"عبريَّةٌ، لفظها عندهم

٢٣٢- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص١٩٥

٢٣٣- الأنبياء: ٩٦

٢٣٤- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص١٩٥

٢٣٥- سیوطی، **المهذب**، ص٥٤

٢٣٦- سیوطی، نفس مصدر، ص٥٤

"حِطًّا."[٢٣٧] (عبری زبان کا کلمہ ہے، جو اُن کے ہاں "حِطًّا" پڑھا جاتا ہے۔) راغب لکھتے ہیں: "كَلِمَةٌ أُمِرَ بها بني إسرائيل، ومعناه: حُطَّ عَنَّا ذُنوبنا، وقيل معناه: قولوا صوابًا."[٢٣٨] (بنی اسرائیل کو اس کلمہ کو پڑھنے کا حکم دیا گیا تھا، جس کا معنی یہ ہے کہ ہمارے گناہ ہم سے اُتار دے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے معنی ہیں :درست اور ٹھیک بات کہا کرو۔)

حَوارِيُّوْن

یہ کلمہ سورۃ اٰل عمران: ۵۲، سورۃ المائدۃ:۱۱۱، ۱۱۴اور سورۃ الصف: ۱۴میں وارد ہے۔

حَواريٌّ کی جمع ہے، راغب نے لکھا ہے:

(حَوَّرتُ الشَّيءَ: کسی چیز کو گھمانا،(کپڑے کا) سفید کرنا اسی سے اَلْخُبْزُ الْحَوَّار ہے جس کے معنی میدے کی روٹی کے ہیں۔ سیدنا عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے اَنصار واَصحاب کو حَوَارِیّیْن کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قَصَّار یعنی دھوبی تھے جب کہ بعض نے کہا ہے کہ وہ صَیَّاد یعنی شکاری تھے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ ان کو حَوَارِیّیْن اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو علمی اور دینی فائدہ پہنچا کر گناہوں کی میل سے اپنے آپ کو پاک کرتے تھے، جس پاکیزگی کی طرف آیت کریمہ: ﴿ إِنَّمَا يُرِيدُ ٱللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ ٱلرِّجْسَ أَهْلَ ٱلْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا ﴾[٢٣٩] میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر انھیں تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قَصَّارْ کہہ دیا گیا ہے ورنہ اصل میں وہ دھوبی کا کام نہیں کرتے تھے۔ اس سے وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جو معرفتِ حقائق کی بنا پر عوام میں متداول پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار نہ کرے، اسی طرح ان کو صَیَّادْ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو حیرت سے نکال کر حق کی طرف لا کر گویا ان کا شکار کرتے تھے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سیدنا زبیر رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کے بارے میں فرمایا: "الزُّبيرُ ابنُ عمتِي وحوارِيَّ من أمتي."[٢٤٠]

٢٣٧- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص ١٩٥

٢٣٨- راغب اصفہانی، مصدرِ سابق، ص ١٢٢

٢٣٩- الأحزاب: ٣٣

٢٤٠- ابن ابی شیبہ، **مصنف ابن أبي شيبه**، كتاب الفضائل، ما حفظت في الزبير بن العوام، حدیث:٣٢٨٢٦

(زبیر میرا پھوپھی زاد بھائی اور حواری ہے) نیز فرمایا: "إنَّ لكل نبي حواريٌّ وحوارِيَّ الزُّبيرُبن العوم."[٢٤١]

(بے شک ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری رہا ہے اور میرا حواری زبیر بن عوام ہے۔)[٢٤٢]

اس روایت میں سیدنا زبیر رضی اللہ عنہ کو حواری کہنا محض نصرت اور مدد کے لحاظ سے ہے، جیسا کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿ مَنْ أَنصَارِيٓ إِلَى ٱللَّهِ قَالَ ٱلْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ ٱللَّهِ ﴾[٢٤٣] (بھلا کون ہیں جو اللہ کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں۔) ابن ابی حاتم لکھتے ہیں: "بالنبطية: هواري، وبالعربية: المُحَوِّرُ"[٢٤٤] (نبطی زبان میں "ہواری" عربی میں "اَلْمُحَوِّرْ" (سفید کرنے والا) ہوا۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "هم الغَسَّالونَ بالسريانية من "حورا" أي: الأبيض، لأنَّ أصحاب المسيح كانوا يغسلون الثياب ويبيِّضونها، وهي كذلك بالنبطية من "هواري."[٢٤٥]

(سریانی زبان میں "حورا" بمعنی سفید سے نکلا ہوا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے ساتھی دھوبی کا کام کرتے اور کپڑوں کو سفید کرتے تھے، جب کہ نبطی زبان میں یہ "ہواری" ہے۔)

حُوبٌ

ابن فارِس لکھتے ہیں: "الحاء والواو والباءُ أصلٌ واحدٌ يتشعَّبُ إلى إثم أوحاجةٍ أومَسكنةٍ."[٢٤٦] (ح، و، ب کے بنیادی معنی گناہ، حاجت یا مَسکنت کے ہیں۔) راغب لکھتے ہیں: "الحَوبة أي المسكنةَ والحاجةَ وحقيقتها هي الحاجة التي تحمِلُ صاحِبَها على ارتكابِ الاثمِ."[٢٤٧] (الحَوبة کے معنی مسکنت وحاجت کے ہیں، ایسی حاجت جو محتاج کو ارتکابِ جرم پر آمادہ کرے۔) قرآن مجید میں

٢٤١- صحیح بخاری، **كتاب الجهاد والسير**، باب هل يبعث الطليعة وحده، حدیث: ٢٨٤٧

٢٤٢- راغب اصفہانی، مصدرِ سابق، ص ١٣٥

٢٤٣- الصف: ١٤

٢٤٤- ابن ابی حاتم، **تفسير ابن أبي حاتم**، ج ٢، ص ٦٥٩

٢٤٥- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص ١٩٥

٢٤٦- ابو الحسین زکریا، **معجم مقاييس اللغة**، باب الحاء والواد وما معهما من الحروف الثلاثي

٢٤٧- راغب اصفہانی، مصدرِ سابق، ص ١٣٤

یتیم کا مال کھانے کو حُوْبًا کَبِیْرًا [۲۴۸] کہا گیا ہے۔ سیوطی نے مسائل نافع بن ارزق کے حوالے سے سیدنا ابن عباس علیہ السلام سے نقل کیا ہے :"حوبًا: إثمًا، بلغة الحبشة."[۲۴۹] (حُوْبٌ کے معنی حبش کی لغت میں گناہ کے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں:"حوب کے معنی گناہ کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حبشی زبان کا کلمہ ہے اور یہ بھی کہ یہ عربی کلمہ ہے۔" [۲۵۰]

دَاود علیہ السلام

جوہری لکھتے ہیں: داود عجمی نام ہے۔[۲۵۱] ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں: "یہ عبرانی میں داوِد اور داوِید ہے، جب کہ سریانی میں دُوَید اور داوید ہے۔ تعریب کے وقت "د" کو پیش دیا گیا۔ عبری میں اس کے معنی محبوب کے ہیں۔" [۲۵۲]

دَرَسْتَ

﴿ وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ ٱلْأَيَٰتِ وَلِيَقُولُواْ دَرَسْتَ ﴾[۲۵۳] (اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں[تاکہ ان پر حجت قائم ہو]اور تاکہ وہ بول اُٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنادیا۔) سیوطی لکھتے ہیں: "دَارَسْتَ معناهُ:قارأتَ، بلغة اليهود."[۲۵۴] (دَارَسْتَ کے معنی یہود کی لغت میں قارأتَ کے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "دَرَسْتَ:من الدِّراسةِ العِبرية بمعنى:قرأتَ، والمِدراشُ

۲۴۸- النساء: ۲

۲۴۹- سیوطی، **الإتقان في علوم القرآن**، ج۱، ص۱۸۱

۲۵۰- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۵

۲۵۱- جوہری، **الصحاح**، فصل الدال، مادہ: د و د

۲۵۲- عبدالرحیم، هامش **المعرب**، ص۳۰۹

۲۵۳- الأنعام: ۱۰۵

۲۵۴- سیوطی، مرجع سابق،، ج۱، ص۱۸۱

عندهم: المدرسة التي تدرس فيهاالتوراة، وشِينهم سينٌ عربيةٌ." [۲۵۵](دَرَسْتَ عبرانی کے دِراسَة سے ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں اُن کے نزدیک المِدراشُ وہی ہے جو ہمارے ہاں مدرسہ ہے۔ المِدراشُ میں تورات پڑھائی جاتی اوراُن کا"ش" عربی کا "س" ہے۔) اور مولانا اصلاحی صاحب کا نقطہ نظر ہے کہ: دَرَسَ کے اصلی معنی توگھسنے اورمٹانے کے ہیں ، دَرَسَ الرَّسْمَ کے معنی ہوں گے: مَحَاهُ، نشان کومٹادیا۔ آدمی جب کسی چیز کو کثرت سے باربارپڑھتاہے، بالخصوص جب اس پرانگلی رکھ کر ایک ایک حرف کو متعین کرکے پڑھتاہے، جیساکہ مذہبی صحیفوں کی تلاوت کے لیے رواج ہے، توبالعموم وہ نسخے گِھس جاتے ہیں۔ اس وجہ سے لفظ دَرَسَ کسی کتاب کواچھی طرح باربار، کرات ومرات پڑھنے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ لغت میں اس بات کویوں تعبیر کرتے ہیں:دَرَسَ الْكِتٰبَ:أقْبَلَ عليه يحفظه.[۲۵۶]

دِرْهَمٌ

چاندی کے ایک سکے کا نام ہے، اس کی جمع دَرَاهِمٌ ہے۔ یہ عربی لفظ نہیں۔ بعض نے اس کی اصل فارسی قرار دی ہے اور بعض نے یونانی۔ جوہری لکھتے ہیں: "الدِرْهَمُ فارسي معرب، وكسرالهاء لغة، وربما قالوا: دِرْهَامٌ...وجمع الدرهم: دراهم وجمع الدراهم:دراهيم.[۲۵۷] (دِرْهَمْ فارسی سے معرب ہے، اسے دِرْهِمْ بھی پڑھاجاتاہے اور کبھی کبھی دِرْهَام بھی کہتے ہیں۔ دِرْهَمْ کی جمع دَرَاهِمْ اور جمع الجمع دَرَاهِيْم ہے۔) ڈاکٹرعبدالرحیم لکھتے ہیں :"وهوبالفارسية الحديثة "درم" وبالفهلوية Dirm (درم) و Diraxm (دِرْخَمْ) و Dirham (درهم) ويبدو أنه دخل في العربية من الفهلوية وعُرِّبَ من الصيغة الأخيرة"[۲۵۸] (جدید فارسی میں اسے درم پڑھاجاتاہے۔ پہلوی میں دِرَم، دِرْخَم اور

۲۵۵- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۶

۲۵۶- امین احسن اصلاحی، **تدبر قرآن**، لاہور، فاران فاؤنڈیشن، ۲۰۰۵، ج۳، ص۱۳۳

۲۵۷- جوہری، مرجع سابق، فصل الدال، مادہ: درهم

۲۵۸- عبدالرحیم، هامش **المعرب**، ص۳۰۷

دِرْہمْ ہے اور بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربی زبان میں پہلوی زبان سے در آیا ہے، بالخصوص آخری کلمے سے۔) قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ ﴾[٢٥٩] (اور انھوں نے اُس کو ایک حقیر قیمت، چند درم کے عوض بیچ دیا۔)

دُرِّيٌّ

سیوطی لکھتے ہیں: "دُرِّيٌّ معناه: المضيئ بالحبشية، حكاه شيدلة و أبو القاسم."[٢٦٠] (دُرِّيٌّ کے معنی روشن کے ہیں، یہ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ شیدلہ اور ابو القاسم نے بھی ایسا کہا ہے۔) قرآن مجید میں ہے: ﴿ ٱلزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ ﴾[٢٦١] (شیشہ ایک چمکتے تارے کی مانند ہو۔)

دِيْنَارٌ

ابن درید اور جوالیقی لکھتے ہیں: "والدِّينارُ فارسي معرب، وأصله دِنَّارٌ، وهو وإن كان معرَّبًا فليس تعرف له العَرَبَ اسمًا غير الدينار فقد صار كالعربي، ولذلك ذكره الله تعالى في كتابه لأنه خاطَبَهُم بما عرفوا"[٢٦٢] (دینار فارسی سے معرب ہے، جس کی اصل دِنَّار ہے، یہ اگرچہ معرب ہے، لیکن عرب اس کے لیے کوئی دوسرا نام نہیں جانتے اس لیے یہ عربی زبان کا لفظ ٹھہرا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لیے اسی نام کو اپنی کتاب میں ذکر کیا کہ اس نے عربوں کو اُن کے مانوس کلام سے مخاطب کیا ہے۔) ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں: "یہ اصل میں لاطینی ہے جس کی اصل Denarius ہے جس کے معنی "دس آسات" کے ہیں، جب کہ آس (As) پیتل کا ایک سکہ ہے۔ لاتینی سے یہ سریانی میں آیا اور وہاں سے پہلوی میں۔ پہلوی میں اسے Denar پڑھا جاتا ہے اور غالب گمان یہ ہے کہ یہ عربی میں پہلوی کے راستے آیا ہے۔"[٢٦٣] قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَمِنْهُم مَّنْ إِن

٢٥٩- یوسف:١٢

٢٦٠- سیوطی، مرجعِ سابق، ج١، ص١٨١

٢٦١- النور: ٣٥

٢٦٢- ابو بکر درید، **جمهرة اللغة**، باب الدال و الدار، مادہ: د ر و؛ عبد الرحیم، هامش **المعرب**، ص٢٩٠

٢٦٣- عبد الرحیم، نفسِ مرجع، ص٢٩٠

تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِۦٓ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ﴾[٢٦٤](اوران میں سے وہ بھی ہیں کہ اگر تم اُن کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اُس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم اُس کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔)

رَاعِنَا

ابو نعیم نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے: "لاتَقُوْلُوْا رَاعِنَا، وذلک أنَّهاسُبَّةٌ بِلُغَةِ اليهود."[٢٦٥] (یہود کی زبان میں رَاعِنَا ایک گالی کے معنوں میں مستعمل ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "عبرانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی سبّ و تنقیص کے ہیں۔"[٢٦٦] قرآن مجید میں ہے: ﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقُولُواْ رَٰعِنَا وَقُولُواْ ٱنظُرْنَا ﴾[٢٦٧](ایمان والو! رَاعِنَا مت کہو اور اُنْظُرْنَا کہو۔) رَاعِنَا کو ذرا نیچے کی طرف دبا کر ادا کیجیے تو بڑی آسانی سے رَاعِیْنَا بن جائے گا جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں۔ یہود کی اس شرارت کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے: ﴿ مِّنَ ٱلَّذِينَ هَادُواْ يُحَرِّفُونَ ٱلْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِۦ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَٱسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَرَٰعِنَا لَيًّۢا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى ٱلدِّينِ ﴾[٢٦٨] (یہود میں وہ لوگ بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور اپنی زبانوں کو لچکا کر کہتے ہیں: سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا دین پر طنز کرنے کے لیے۔) مگر اس کی سند شدید ضعیف ہے، اس لیے کہ: اس کا ایک راوی موسیٰ بن عبد الرحمن ثقفی صنعانی ہے، جس کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے: ثقہ نہیں[٢٦٩] هَالِكٌ ہے۔[٢٧٠] ابن حبان لکھتے ہیں: شیخ اور دجال ہے۔ احادیث وضع

٢٦٤- آل عمران: ٧٥

٢٦٥- ابو نعیم اصفہانی، **دلائل النبوة**، ت: ڈاکٹر محمد رواس قلعہ جی، بیروت، دار النفائس، ١٤١٢-١٩٩١ء، ص ٤٤؛ روایت: ٦، سیوطی، **الإتقان**، ج ١، ص ١٨١

٢٦٦- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ص ١٩٦

٢٦٧- البقرة: ١٠٤

٢٦٨- النساء: ٤٦

٢٦٩- ذہبی، **میزان الاعتدال**، ج ٤، ص ٢١١

٢٧٠- ذہبی، **المغني في الضعفاء**، ت: نور الدین عتر، بدون ناشر و تاریخ، ج ٢، ص ٦٨٤

کرتا ہے۔ اس نے کلبی اور مقاتل بن سلیمان کی کتابوں سے ایک تفسیر جمع کی اور پھر ابن جریج عن عطاء عن ابن عباس صکی سند سے اس کی روایت کرنے لگا۔[۲۷۱] ابن عدی لکھتے ہیں: منکر الحدیث ہے۔[۲۷۲]

رَبَّانِيُّوْنَ

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ ٱللَّهُ ٱلْكِتَٰبَ وَٱلْحُكْمَ وَٱلنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا۟ عِبَادًا لِّى مِن دُونِ ٱللَّهِ وَلَٰكِن كُونُوا۟ رَبَّٰنِيِّـۧنَ ﴾[۲۷۳] (کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کتاب، قوتِ فیصلہ اور منصبِ نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو دعوت دے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو لوگوں کو یہ دعوت دے گا کہ لوگو! اللہ والے بنو۔) ﴿ يَحْكُمُ بِهَا ٱلنَّبِيُّونَ ٱلَّذِينَ أَسْلَمُوا۟ لِلَّذِينَ هَادُوا۟ وَٱلرَّبَّٰنِيُّونَ وَٱلْأَحْبَارُ بِمَا ٱسْتُحْفِظُوا۟ مِن كِتَٰبِ ٱللَّهِ ﴾[۲۷۴] (اسی کے مطابق انبیا جو (اللہ کے) فرمان بردار تھے، یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں اور مشائخ وعلما بھی کیوں کہ وہ کتاب اللہ کے نگہبان مقرر کیے گئے تھے۔) ﴿ لَوْلَا يَنْهَىٰهُمُ ٱلرَّبَّٰنِيُّونَ وَٱلْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ ٱلْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ ٱلسُّحْتَ ﴾[۲۷۵] (ان کے علما اور فقہاء ان کو گناہ کی بات کہنے اور ان کو حرام کھانے سے روکتے کیوں نہیں؟) ازہری نے ابن اعرابی کے حوالے سے لکھا ہے کہ: "الرباني:العالم المُعَلِّمُ الذي يَغْذُواالناسَ بصغارالعلوم قبل كبارها."[۲۷۶] (ربانی وہ بڑا عالم ہے جو لوگوں کو ابتدا میں چھوٹے علوم سکھاتے ہیں اور تدریجاً انھیں بڑے علوم کی طرف لے جاتا ہے۔)

راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

۲۷۱- ابن حبان، **المجروحين من المحدثين**، سعودیہ، دار الصحیحین، ۱۴۲۰ھ - ۲۰۰۰ء، ج۲، ص۲۵۰

۲۷۲- ابو احمد عبد اللہ بن عدی جرجانی، **الكامل في الضعفاء**، ت: جمادل احمد عبد الموجود، بیروت، دار الکتب العلیمة، ۱۴۱۸ھ-۱۹۹۷ء، ج۸، ص ٦٦

۲۷۳- اٰل عمران: ۷۹

۲۷۴- المائدة: ۴۴

۲۷۵- المائدة: ٦٣

۲۷۶- ازہری، **تهذيب اللغة**، مادہ: ربّ

رَبَّانِيٌّ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ وہ رَبَّانٌ کی طرف منسوب ہے اور لفظ فَعْلاَن فَعِلَ (بکسر العین) سے بنایا جاتا ہے جیسے عَطْشَانْ اور سَکْرَانْ اور قلت کے ساتھ فَعَلَ (بفتح العین) سے بنتا ہے جیسے نَعسان آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ رَبٌّ کی طرف منسوب ہے جو مصدر ہے اور رَبَّانِيٌّ وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسا کہ حکیم ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ منسوب تو اسی کی طرف ہے جو مصدر ہے اور اس کے معنی اُس شخص کے ہیں جو اپنے نفس کی علم کے ذریعے تربیت کرے اور حقیقت میں یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں، کیوں کہ جس نے بہ ذریعۂ علم اپنے نفس کی پرورش کی اور جس نے علم کی پرورش کی اس نے اس کے ذریعہ اپنے نفس کی پرورش کی۔ بعض کا قول ہے کہ یہ رَبٌّ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے، پس جیسے اِلٰهِيٌّ ہے اسی طرح رَبَّانِيٌّ ہے اور نون کا اضافہ اس میں ایسا ہی ہے جیسا کہ اہلِ عرب لِحْيَانِيٌّ اور جِسْمَانِيٌّ کے بولتے وقت کرتے ہیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: میں اسی امت کا رَبَّانِي ہوں۔ اس کی جمع رَبَّانِيُّوْنَ ہے اور بعض کا قول ہے کہ لفظِ رَبَّانِيٌّ اصل میں سریانی ہے اور یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یہ اہل عرب کے کلام میں قلیل الوجود ہے۔[٢٧٧]

ازہری لکھتے ہیں: "روي عن علي رضی اللہ عنہ أنه قال: الناسُ ثلاثةٌ: عالمٌ ربَّانِيٌّ، ومتعلمٌ على سبيل النجاة، وهمجٌ رَعاعٌ أتباع كل ناعق. قال: والرَّبَّانِيُّ: العالي الدرجةَ في العلم."[٢٧٨]
(سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں کی تین قسمیں ہیں: ربانی عالم، متعلم جو نجات کی راہ پر گام زن ہے اور باقی لوگ رذیل اور بازاری ہیں جو ہر پروپیگنڈہ کرنے والے کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ پھر فرمایا رَبَّانِي وہ ہے جو علم میں سب سے بڑا ہو۔) جوالیقی لکھتے ہیں: "والرَّبَّانِيُّوْنَ ، قال أبوعبيد:أحسب الكلمة ليست بعربية، إنما هي عبرانيةٌ أوسريانيةٌ."[٢٧٩] (ابوعبید کہتے ہیں کہ میرے نزدیک رَبَّانِيٌّ بنیادی طور پر عربی کلمہ نہیں ہے، بلکہ یہ عبرانی یا سریانی زبان کا لفظ ہے۔) خفاجی لکھتے ہیں: "رَبَّانِيُّوْنَ:أي علماء، قيل: هي عبرانيةٌ معربةٌ لأن العرب لاتعرفها."[٢٨٠] (رَبَّانِيُّوْنَ کے معنی علما کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عبرانی

٢٧٧- راغب اصفہانی، المفردات، ص ١٨٤

٢٧٨- ازہری، تہذیب اللغة، مادہ: ربّ

٢٧٩- جوالیقی، المعرب، ص ٣٣٠

٢٨٠- خفاجی، شفاء الغليل، ص ١٦٠

زبان سے معرب ہوا ہے۔ بنیادی طور پر عرب اس سے واقفیت نہیں رکھتے۔)ابن تیمیہ کو اس رائے سے اختلاف ہے کہ یہ سریانی یاعبرانی لفظ ہو، چناں چہ لکھتے ہیں: "قلتُ:اللفظةُ عربيةٌ منسوبةٌ إلى رَبَّانِ السفينةِ الذي ينزلهاويقوم لمصلحتها، ولكن العرب في جاهليتهم لم يكن لهم ربانيون، لأنهم لم يكونواعلى شريعةٍ منزَّلةٍ من الله."[٢٨١] (میں (حافظ ابن تیمیہ) کہتاہوں کہ یہ عربی زبان کالفظ اور رَبَّانُ السفينةِ (کشتی کا ناخدا) کی طرف منسوب ہے، جو کشتی کو بہ خیر وخوبی اپنے منزل کی طرف لے جاتاہے، یہ الگ بات ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کاکوئی رَبَّان نہیں تھا اس لیے کہ وہ کسی منزل من اللہ شریعت پر نہیں تھے۔)

رِبِّيُّوْنَ

﴿ وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَـٰتَلَ مَعَهُۥ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ ﴾[٢٨٢] (اور کتنے انبیا گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی۔) راغب لکھتے ہیں: "فَالرِّبِّيُّ كالرَّبَّانِيِّ."[٢٨٣] (رِبِّيٌّ، رَبَّانِيٌّ کی طرح ہے۔) امام بخاری لکھتے ہیں:"رِبِّيُّوْنَ، الجميعُ، والواحِدُ:رِبِّيٌّ."[٢٨٤](رِبِّيُّوْنَ کے معنی جماعتوں کے ہیں، جس کاواحد رِبِّيٌّ ہے۔)ابن حجر لکھتے ہیں:"یہ معنی اصل میں ابوعبیدہ سے منقول ہیں"[٢٨٥] بیضاوی لکھتے ہیں: "الرِّبِّيُّ منسوبٌ إلى الرِّبَّةِ، وهي الجماعةُ، للمبالغةِ."[٢٨٦] (رِبِّيٌّ، رِبَّةٌ کی طرف بہ طور مبالَغہ منسوب ہے جس کے معنی جماعت کے ہیں۔) سیوطی نے ابوحاتم احمد بن حمدان لغوی کی کتاب **الزينة** کے حوالے سے

٢٨١- ابن تیمیہ، **مجموع الفتاوى**، ج١، ص ٨٢

٢٨٢- آل عمران: ١٤٦

٢٨٣- راغب اصفہانی، مرجع سابق،، ص ١٨٤

٢٨٤- **صحيح البخاري**، كتاب تفسير القرآن، باب آمن الرسول بما أنزل إليه من ربه

٢٨٥- عسقلانی، **فتح الباري**، ج٨، ص٢٠٨

٢٨٦- بیضاوی، **تفسير البيضاوي**، ج٢، ص٤١

لکھاہے کہ یہ سریانی لفظ ہے۔[۲۸۷] اس کی ایک قراءت رُبِّیُّوْنَ ہے جس کے بارے میں کہاگیاہے کہ: "الرُّبِّیُوْنَ نُسِبُوْا إلی الرُّبَّةِ، والرُّبَّةُ:عشرةُ آلافٍ."[۲۸۸] (رُبِّیُّوْنَ، رُبَّةٌ کی طرف منسوب ہے۔رُبَّةٌ کالفظ دس ہزارکے لیے بولاجاتاہے۔) ڈاکٹرعبدالرحیم لکھتے ہیں :"رُبِّیُّوْنَ بمعنی الألوف والجماعة الکثیرة، وھوبھذا المعنی مأخوذٌ من الرُّبَّةِ ومعناھا عشرةُ آلاف."[۲۸۹] (اس کے معنی ہزاروں اَفرادپر مشتمل ایک بڑی جماعت کے ہیں۔ یہ رُبَّةٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دس ہزار کے ہیں۔)

الرَّسُّ

قرآن مجید میں دوجگہ:سورة الفرقان:۳۸،سورة ق:۱۲ میں یہ لفظ مستعمل ہے۔رَسٌّ کے معنی کنویں کے ہیں ۔ مجاہدنے اس کایہی معنی کیاہے۔[۲۹۰] امام بخاری لکھتے ہیں: "الرَّسُّ:اَلْمَعْدِنُ، جمعه: رِسَاسٌ"[۲۹۱] (رَسٌّ کے معنی مَعْدِنْ (کان) کے ہیں اور اس کی جمع رِسَاسٌ ہے۔)ابن حجرعسقلانی کہتے ہیں: یہ ابوعبیدۃ کاقول ہے، جب کہ خلیل کہتے ہیں کہ: " الرَّسُّ کلُّ بئرٍتکون غیرمطویة."[۲۹۲] (ہروہ کنواں جس کی کوٹھی پختہ تعمیرنہ کی جائے رَسٌّ کہلاتاہے۔) محمودبن حمزۃ کرمانی لکھتے ہیں: الرَّسُّ عجمي نام ہے۔[۲۹۳]

۲۸۷- سیوطی، **الإتقان في علوم القرآن**،ج۱،ص۱۸۱

۲۸۸- ازہری، مرجع سابق،ج۱۵،ص۱۳۰

۲۸۹- عبدالرحیم، ھامش **المعرب**،ص۳۳۲

۲۹۰- ابن ابی حاتم، **تفسیرابن أبي حاتم**، ج۸،ص۲۶۹۵

۲۹۱- امام بخاری، **صحیح البخاري**، کتاب التفسیر، تفسیر سورة الفرقان

۲۹۲- عسقلانی، مصدرِسابق،ج۸،ص۴۹۱

۲۹۳- محمودبن حمزہ کرمانی،**غرائب التفسیر**،ج۲،ص۸۱۶؛ سیوطی،مرجع سابق،ج۱،ص۱۸۱

الرَّقِیْمُ

﴿ أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَٰبَ ٱلْكَهْفِ وَٱلرَّقِيمِ كَانُوا۟ مِنْ ءَايَٰتِنَا عَجَبًا ﴾ [۲۹۴] (کیا تم نے کہف و رقیم والوں کو ہماری نشانیوں میں سے کچھ بہت عجیب خیال کیا؟) ابن دُرَید نے رَقِیْمٌ کے معنی دوات کے کیے ہیں۔[۲۹۵] سیوطی نے شیدلہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ رومی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی لوح یعنی تختی کے ہیں۔[۲۹۶] ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "رقیم کے معنی: تختی یا دوات کے ہیں یا یہ کسی گاؤں یا پہاڑ کا نام ہے اور یہ رومی زبان کا لفظ ہے۔"[۲۹۷] اصحابِ کہف کو اصحابِ کہف و رقیم اس لیے کہا گیا کہ عرب کے اہلِ کتاب میں یہ لوگ اسی لقب سے معروف تھے۔ غار میں پناہ لینے کی وجہ سے اُن کی نسبت اس کی طرف کی گئی۔ رہی رقیم کی طرف نسبت، تو اس کے بارے میں مفسرین کے ہاں کئی اقوال ہیں۔ کعب الاحبار کا خیال تھا کہ رقیم اُس بستی کا نام ہے جس سے نکل کر اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی۔ رقیم وادی کو بھی کہتے ہیں: جدید تحقیقات کی بنیاد پر دورِ حاضر کے بعض اہل علم محققین نے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ رقیم وہی شہر ہے جسے پیٹرا کے نام سے شہرت ملی اور عرب اسے بطرا کہتے ہیں۔

رَمْزٌ

ابن فارِس لکھتے ہیں: "الرَّاءُ والمِيمُ والزَّاءُ أصلٌ واحدٌ يدُلُّ على حركةٍ واضطرابٍ."[۲۹۸] (الرَّمْزُ کے اصلی معنی جنبش، حرکت اور اضطراب کے ہیں۔) راغب لکھتے ہیں: "الرَّمزُ: إشارةٌ بِالشَّفَهِ، والصَّوتُ الخَفِيُّ، والغَمْزُ بالحاجِبِ، وعُبِّرَ عن كلِّ كلامٍ كإشارةٍ بالرَّمْزِ كما عُبِّرَ عن الشِّكايةِ

۲۹۴- الکہف:۹

۲۹۵- ابو بکر بن حسن بن درید ازدی، الاشتقاق، ت: عبد السلام محمد ہارون، بیروت، دار الجیل، ط۱، ۱۴۱۱ھ-۱۹۹۱ء، ص ۴۷

۲۹۶- سیوطی، مرجع سابق، ج۱، ص ۱۸۱

۲۹۷- تونجی، المعرب والدخیل، ص ۱۹۶

۲۹۸- ابن فارس، معجم مقاییس اللغة، مادہ: رمز

بِالغَمْزِ." [۲۹۹] (رَمْزٌ کے معنی ہیں: لبوں سے اشارہ کرنے، مخفی آواز اور ابرو کے ذریعہ ایما کے، نیز ہر وہ بات جو اشارہ کی طرح ہو اُسے رَمْزٌ سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح شکایت کی تعبیر غَمْزٌ سے کی گئی ہے۔) ابن جوزی لکھتے ہیں: "بِلُغَةِ النَّبط: الرَّمْزُ: الإيماءُ" [۳۰۰] (نبطی زبان میں رَمْزٌ کے معنی اشارہ کے ہیں۔) سیوطی لکھتے ہیں: "عَدَّهُ ابن الجوزي في **فنون الأفنانِ** من المعرب، وقال الواسطي: هو تحريک الشفتين بالعِبرِيَّة." [۳۰۱] (ابن جوزی نے **فنون الأفنان** میں اس لفظ کو معرب میں شمار کیا ہے اور واسطی کہتے ہیں: عبرانی زبان میں اس کے معنی ہونٹ ہلانے کے ہیں۔) قرآن مجید میں ہے: ﴿ قَالَ ءَايَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ ٱلنَّاسَ ثَلَٰثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْزًا ﴾ [۳۰۲] (فرمایا: تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔)

رَهْوٌ

﴿ وَٱتْرُكِ ٱلْبَحْرَ رَهْوًا ۖ إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ ﴾ [۳۰۳] (اور دریا کو ساکن چھوڑ دو، یہ ڈوبنے والی فوج بنیں گے۔) ابن فارس لکھتے ہیں: اس لفظ کے بنیادی طور پر دو معنی ہیں: "يدُلُّ أحدهما على دَعَةٍ وخَفْضٍ وسُكُونٍ، والآخرُ على مكان قد ينخفضُ ويرتفع." [۳۰۴] (جن میں سے ایک اطمینان وسکون پر دلالت کرتا ہے اور دوسرا معنی اُس جگہ پر جو کبھی بلند ہو جاتی ہو اور کبھی پست۔) سیوطی لکھتے ہیں: "قال أبو القاسم في قوله تعالى: ﴿ وَٱتْرُكِ ٱلْبَحْرَ رَهْوًا ﴾ أي: سهلًا دمثًا، بِلُغَةِ النَّبط، وقال الواسطي: أي ساكنًا بالسُّيانية." [۳۰۵] (ابو القاسم نے فرمانِ الٰہی: ﴿ وَٱتْرُكِ ٱلْبَحْرَ رَهْوًا ﴾ کے معنی یہ بیان کیے

۲۹۹- راغب اصفہانی، مرجع سابق، ص ۲۰۳

۳۰۰- ابن جوزی، **فنون الأفنان**، ص ۱۱۷

۳۰۱- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

۳۰۲- اٰل عمران: ۴۱

۳۰۳- الدخان: ۲۴

۳۰۴- ابن فارس، مصدرِ سابق، ص ۴۰۴

۳۰۵- سیوطی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۸۱

ہیں کہ نبطی زبان میں اس کے معنی اُس دریا کے ہیں جو ساکن اور جوش وخروش کے بغیر ہو، جب کہ واسطی کہتے ہیں کہ سریانی میں اس کے معنی ساکن دریا کے ہیں۔) مفسر قرطبی لکھتے ہیں: "هومن نعتِ البحرِ، أي: أتركهُ ساكنًا كما هو قد انفرق، فلاتأمرهُ بالانضمام حتى يدخل فرعون وقومه."[۳۰۶] (رَهْوٌ یہاں دریا کی صفت کے طور پر واقع ہوا ہے یعنی دریا (کے پانی) کو ویسا ہی کھڑا رہنے دیجیے اور اسے پہلے کی طرح منضم اور باہم دگر پیوست ہو جانے کا حکم نہ دیں یہاں تک کہ فرعون اور اس کا لشکر اس میں داخل ہو جائے۔)

الرُّوْمُ

روم کے نام سے قرآن مجید میں ایک سورت ہے، جس میں مذکور ہے کہ: ﴿ الٓمٓ * غُلِبَتِ ٱلرُّومُ * فِيٓ أَدۡنَى ٱلۡأَرۡضِ وَهُم مِّنۢ بَعۡدِ غَلَبِهِمۡ سَيَغۡلِبُونَ * فِي بِضۡعِ سِنِينَ ﴾[۳۰۷] (الف، لام، میم۔ رومی پاس کے علاقے میں مغلوب ہوئے اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عن قریب چند سالوں میں غالب آجائیں گے۔) أَدۡنَى ٱلۡأَرۡضِ سے مراد یہاں شام وفلسطین کی سرزمین ہے جو عرب کی سرزمین سے بالکل متصل تھی۔ اس علاقے پر اس زمانے میں رومیوں کی حکومت تھی، لیکن وہ اس وقت سخت اندرونی خلفشار میں مبتلا تھے جس سے فائدہ اُٹھا کر ایرانیوں نے ان پر حملہ کر دیا اور ان علاقوں سے ان کو بے دخل کر دیا۔ یہ واقعہ ۶۱۴م یعنی نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے چھٹے یا ساتویں سال پیش آیا۔ غَلَبٌ اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے۔ یہ قرآن مجید نے پیشین گوئی فرمائی کہ اگرچہ رومی اس وقت مغلوب ہو گئے ہیں، لیکن یہ مغلوبیت اُن کی عارضی ہے۔ بہت جلد وہ ایرانیوں پر غالب ہو جائیں گے اور اس انقلاب میں، جس کی قرآن مجید خبر دے رہا ہے، زیادہ دن نہیں لگیں گے، صرف چند سالوں کے اندر اندر یہ واقع ہو جائے گا۔ جوالیقی لکھتے ہیں: "الرُّومُ:هذاالجيلُ من الناسِ أعجَمِيٌّ، وقد تكلمت به العربُ قديمًا و نطق به القرآن."[۳۰۸] (روم: عجمی لفظ ہے۔ انسانوں کے خاندان اور نسل کے لیے مستعمل ہے۔ عرب زمانۂ قدیم سے اس سے آشنا ہیں اور اسے قرآن مجید نے بھی استعمال

۳۰۶- قرطبی، تفسیر القرطبي، ج۱۶، ص۱۲۰

۳۰۷- الروم: ۱-۴

۳۰۸- جوالیقی، المعرب، ص۳۳۵

کیاہے۔) جوہری لکھتے ہیں: "والرُّوم هم من ولد الرُّوم بن عِيصُو يقال:رُومِيٌّ ورُومٌ، مثل زنجي وزنج، فليس بين الواحد والجمع إلاَّ الياء المشددة."[۳۰۹] (روم بن عیصو کی اولاد روم کہلاتی ہے، جب کہ ان میں سے واحد کے لیے رومی کا لفظ مستعمل ہے، جیسا کہ زنجی اور زنج مستعمل ہے، ان میں واحد اور جمع میں تمیز وجدائی کے لیے یائے مشدد استعمال کیاجاتاہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "هوباللاتينية Roma اسم رومية سمي باسم مؤسسها الأسطوري وأولِ ملوكها Romulus."[۳۱۰] (لاطینی زبان میں اسے Roma کہاجاتاہے، اس کے افسانوی بادشاہ کے نام پر اس کانام رکھا گیا، اس کے بادشاہِ اول کا نام Romulus تھا۔)

زَبَانِيَةٌ

﴿ سَنَدۡعُ ٱلزَّبَانِيَةَ ﴾[۳۱۱] (ہم مؤکلانِ دوزخ کو بلائیں گے۔) یہ اُن سرکشوں کو چیلنج ہے کہ اگر کسی کو اپنی قوت وجمعیت پر بڑا ناز ہے تو وہ اپنی ٹولی کو بلائیں ہم بھی اپنی ٹولی کو بلائیں گے اور دیکھیں گے کہ اُن کے اندر کتنا زور ہے۔ اس چیلنج کا عملی مظاہرہ سب سے پہلے معرکۂ بدر میں ہوا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ تعالیٰ کی ٹولی کے آگے قریش کی پوری قوت وجمعیت کس طرح غبار بن کر اُڑ گئی۔ ڈاکٹر عبدالرحیم تونجی لکھتے ہیں: "واحدها زِبْنِيَةٌ، وهُم الملائكة الغِلاظُ وقيل:المتمردون من الإنسِ والجن، وسُمُّواالشُّرَطَ زَبانية، واحدهم زَابِنٌ... ذلک كله من: "زَبان: اللسان" بالفارسية."[۳۱۲] (اس کا واحد زِبْنِيَةٌ ہے، جس کے معنی سخت اور درشت خُو ملائکہ کے ہیں۔ یہ بھی ایک قول ہے کہ جن وانس میں متمردین اور سرکشوں کے لیے استعمال کیا جاتاہے۔ پولیس اور پیادوں کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے، جس کا واحد زَابِنٌ ہے اور یہ سب فارسی کے "زَبان" سے ماخوذ ہیں۔)

۳۰۹- جوہری، **الصحاح**، مادہ: روم

۳۱۰- عبدالرحیم، **المعرب**، ص۳۳۶

۳۱۱- العلق: ۱۸

۳۱۲- تونجی، **المعرب والدخیل**، ص۱۹۷

زَرَابِيُّ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ ﴾[۳۱۳] (اور غالیچے ترتیب سے لگے ہوئے۔) زَرَابِيُّ، زُرْبِيَّةٌ کی جمع ہے۔ یہ تکیوں اور غالیچوں کے معنی میں آتا ہے یعنی قالینوں پر تکیے اور غالیچے ہر طرف بکھرے پڑے ہوں گے۔ بیٹھنے والا جہاں بیٹھے وہ اس کے لیے آسائش کا باعث ہوں گے۔ ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "هي الطَّنَافِسُ الْفَاخِرَةُ، واحدها زُرْبِيَّةٌ، من الفارسية زَر:ذَهَبٌ وبافته منسوجٌ."[۳۱۴] (یہ نہایت قیمتی غالیچوں (بچھونا یا قالین) کو کہا جاتا ہے، اس کی واحد زُرْبِيَّةٌ ہے۔ فارسی زبان کے "زربفت" کا معرب ہے۔ یعنی سونے سے بنی ہوئی؛ زر بمعنی: سونا اور بافتہ کے معنی منسوج یعنی بُنی ہوئی۔)

زَكَرِيَّا عَلَيْهِ السَّلَام

ابن درید، جوالیقی اور خفاجی لکھتے ہیں: "اسم أعجمي، وهو معربٌ."[۳۱۵] (عجمی نام اور معرب ہے۔) ڈاکٹر عبد الرحیم لکھتے ہیں: "عبرانی میں اس کی اصل زَخَرْيَاه اور سریانی میں زَخَرْيَا ہے۔"[۳۱۶]

قرآن مجید نے الأنعام: ۸۵ میں انبیاے بنی اسرائیل کے ضمن میں سیدنا زکریا عَلَيْهِ السَّلَام کا نام بھی لیا ہے۔ ان کے متعلق آل عمران:۳۷-۴۱، مریم:۱-۵ اور الانبیاء: ۸۹-۹۰ میں مذکور ہے کہ وہ خود عمر رسیدہ تھے اور اُن کی بیوی عاقر، لیکن اُن کی بیوی میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی گئی، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿ وَزَكَرِيَّآ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُۥ رَبِّ لَا تَذَرْنِى فَرْدًا وَأَنتَ خَيْرُ ٱلْوَٰرِثِينَ * فَٱسْتَجَبْنَا لَهُۥ وَوَهَبْنَا لَهُۥ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُۥ زَوْجَهُۥٓ ﴾[۳۱۷] (اور زکریا (پر بھی فضل کیا) کہ جب اُس نے اپنے

۳۱۳- الغاشية:۱۶

۳۱۴- تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۷

۳۱۵- ابو بکر محمد بن الحسن بن درید، جمهرة اللغة، ج۲، ص۳۲۴، جوالیقی، المعرب، ص۳۴۹؛ خفاجی، شفاء الغليل، ص۱۶۷

۳۱۶- عبد الرحیم، مرجع سابق، ص۳۴۹

۳۱۷- الأنبياء:۸۹-۹۰

رب کو پکارا کہ اے رب! تو مجھے تنہا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تُو ہے، تو ہم نے اُس کی دعا قبول کی اور ہم نے اُس کو یحییٰ عطا کیا اور اُس کی بیوی کو اس کے لیے ساز گار کر دیا۔)

زَمْهَرِيْرٌ

قرآن مجید میں جنت کے بارے میں ہے: ﴿ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ﴾[۳۱۸] (اس میں نہ تو سخت گرمی دیکھیں گے اور نہ سخت سردی۔) سورج اور زَمْهَرِيْر نہ دیکھنے کا مفہوم یہ ہے کہ جنتی گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے بالکل محفوظ اور جنت کے تختوں پر براجماں ہوں گے۔ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی تو ہو گی مگر اس میں حدّت و تمازت نہ ہو گی۔اسی طرح وہاں کا موسم ہمیشہ خوش گوار، معتدل اور پُر بہار رہے گا۔ خزاں کی نحوست اور بادِ زمہریر کے آزار سے ان کو کبھی سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "المعنى: شدةُ البرودة، من الفارسية زَم: الريح الباردة، وهري:مكانٌ يُروَى بماء المطر."[۳۱۹] (زمهرير کے معنی سردی کی شدت کے ہیں۔فارسی زبان سے ماخوذ ہے۔ زَم کے معنی یخ بستہ ہوا کے ہیں اور هري ایسی جگہ ہے جہاں بہ کثرت بارش برستی ہو۔)

زَنْجَبِيْلٌ

ایک قسم کی جڑ ہے جو زمین میں ہوتی ہے۔عربی میں زَنْجَبِيْل، سندھی میں سنڈھ اور انگریزی میں Ginger کہلاتا ہے۔اردو میں تر کو ادرک اور خشک کو سونٹھ کہتے ہیں۔[۳۲۰] جوالیقی لکھتے ہیں: "والعربُ تصفه بالطيبِ."[۳۲۱] (عربوں کے ہاں یہ اعلیٰ درجے کی خوش بودار چیز شمار ہوتی ہے۔) قرآن مجید میں ہے:

۳۱۸- الدهر:۱۳

۳۱۹- تونجی، مرجع سابق، ص ۱۹۷

۳۲۰- حکیم مظفر حسین اعوان، **کتاب المفردات المعروف خواص الادویہ**، ص ۶۸

۳۲۱- جوالیقی، **المعرب**، ص ۳۵۵

﴿ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنجَبِيلًا ﴾[۳۲۲] (اور وہ اس میں ایک اور شراب بھی پلائے جائیں گے جس میں ملونی چشمہ زنجبیل کی ہوگی۔) خفاجی لکھتے ہیں: "مُعَرَّبٌ، وهوعروقٌ في الأرضِ، وليس شجرًا ولانبتًا كما ظَنَّهُ الدينوري... وقيل: هو عربي منحوتٌ مِن:زَنَأَ في الجبلِ إذاصعده، وهوبعيدٌ." [۳۲۳] (معرب ہے۔ زمین کے اندر ایک جڑ کو کہتے ہیں۔ شجر و نبات کا نام نہیں جیسا کہ دینوری کا خیال ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور زَنَأَ في الجبلِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اوپر چڑھنے کے ہیں، لیکن یہ قول بعید ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "یہ فارسی لفظ شنکبیل، یا شنکویر، یا شنکبیر یا شنکویل" کا معرب ہے۔[۳۲۴] موجودہ فارسی میں اسے شنگویر (شَن گَ وِیْ ر) کہا جاتا ہے۔

سُجَّدًا

قرآن مجید میں ہے کہ: ﴿ وَٱدْخُلُواْ ٱلْبَابَ سُجَّدًا ﴾ [۳۲۵] (اور دروازے میں سر جھکائے ہوئے داخل ہو جاؤ۔) سجدہ کے اصل معنی سر جھکانے کے ہیں۔ اس سر جھکانے کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔ اس کی کامل شکل زمین پر پیشانی رکھ دینے کے ہیں جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں۔ اس آیت میں اس سے مراد صرف سر جھکانا ہے۔ موقع کلام اس کی دلیل ہے۔ سیوطی نے واسطی کے حوالے سے لکھا ہے کہ: "سُجَّدًا أي:مُقنعي الرءوس، بالسريانية." [۳۲۶] (سریانی زبان میں سُجَّدًا کے معنی ہیں: سر جھکائے ہوئے یا سر چُھپائے ہوئے۔) ڈاکٹر محمد تونجی کی بھی یہی رائے ہے۔[۳۲۷]

۳۲۲- الدهر: ۱۷

۳۲۳- خفاجی، **شفاء الغليل**، ص۱۶۸

۳۲۴- عبدالرحیم، مرجع سابق، ص۳۵۵

۳۲۵- البقرة:۵۸

۳۲۶- سیوطی، **الإتقان**، ج۱، ص۱۸۱

۳۲۷- تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۷

السِّجِلُّ

سِجِلٌّ اس دفتر، یا طُومار یا فائل کو کہتے ہیں جس میں لکھے ہوئے اَوراق محفوظ کر لیے جاتے ہیں۔ اس کی جمع سِجِلاَّتٌ ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ يَوْمَ نَطْوِي ٱلسَّمَآءَ كَطَيِّ ٱلسِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ﴾ (۳۲۸) ((اُس دن کا خیال رکھو) جس دن ہم آسمان کو لپیٹ لیں گے جس طرح طُومار میں اَوراق لپیٹتے ہیں۔) راغب اصفہانی لکھتے ہیں: "السِّجِّيْلُ حَجَرٌ وَطِيْنٌ مُخْتَلِطٌ، وأصله فيما قيل فارِسِيٌّ معرَّبٌ، والسِّجِلُّ قيلَ حجرٌ كان يُكتبُ فيه ثم سُمِّيَ كُلُّ مايُكتبُ فيه سِجِلًا." (۳۲۹) (السِّجِّيْلُ، سنگِ گِل کو کہتے ہیں اور اصل میں، جیسا کہ کہا گیا ہے، یہ لفظ فارسی سے معرب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اَلسِّجِلُّ کے اصل معنی اُس پتھر کے ہیں جس پر لکھا جاتا تھا۔ بعد میں ہر اس چیز کو جس پر لکھا جاتا ہے سِجِلٌّ کہنے لگے۔) سید آلوسی بغدادی لکھتے ہیں: "واختُلِفَ في أنه عربيٌّ أومعربٌ، فذهب البصريون إلى أنه عربي، وقال أبوالفضل الرازي: الأصحُّ أنه فارسي معربٌ." (۳۳۰) (اس میں اختلاف ہے کہ آیا یہ لفظ عربی ہے یا معرب ہے۔ بصرہ والے تو اس طرف گئے ہیں کہ یہ عربی لفظ ہے اور ابوالفضل رازی نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے۔) سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث میں وارد ہے کہ: "السِّجِلُّ كان كاتب النبي ﷺ." (۳۳۱) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک کاتب کا نام سجل تھا۔) ابن قیم لکھتے ہیں: "سمعتُ شيخنا أبا العباس ابن تيمية يقول: هذا الحديث موضوعٌ، ولايُعرفُ لرسول الله كاتب اسمه السجل قط، وليس في الصحابة ثمَن اسمه السجل، وكُتَّابُ النبي معروفون، لم يكن فيهم من يقال

۳۲۸- الأنبياء: ۱۰۴

۳۲۹- راغب اصفہانی، مرجع سابق، ص ۲۲۴

۳۳۰- الوسی، روح المعاني، ج ۱۷-۱۸، ص ۱۳۲

۳۳۱- سنن أبي داود، كتاب الخراج والأمارة، باب في اتخاذ الكاتب، حديث: ۲۹۳۵، نَسائی، السنن الكبریٰ، كتاب التفسير، حديث: ۱۱۳۳۵

له السجل، قال:والأيةُ مكيةٌولم يكن لرسول الله كاتبٌ بمكة." [۳۳۲] (میں نے اپنے شیخ ابوالعباس ابن تیمیہ سے سنا ہے کہ یہ روایت موضوع ہے اور رسول اللہ ﷺ کا سجل نامی کوئی کاتب نہیں تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی اس نام کا کوئی شخص نہیں پایا جاتا۔ رسول اللہ ﷺ کے سارے کاتب معروف و مشہور ہیں، جن میں سجل نام کا کوئی کاتب نہیں، نیز یہ آیت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی کاتب نہیں تھا۔)

ابن کثیر لکھتے ہیں:"هذامنكرٌ جدًّا، لايصحُّ أصلًا، وقدصرح جماعة من الحفاظ بوضعه وإن كان في **سنن أبي داود**، منهم شيخنا الحافظ الكبير أبوالحجاج المزي، وقد أفردتُّ لهذا الحديث جزءًا على حدته والحمد لله." [۳۳۳] (یہ روایت شدید منکر ہے اور قطعی طور پر صحیح نہیں۔ یہ روایت اگرچہ **سنن ابی داود** میں ہے لیکن حفاظ کی ایک جماعت نے اس کے موضوع ہونے کی صراحت کی ہے۔ ہمارے شیخ حافظ کبیر ابوالحجاج مزی بھی ان میں سے ہیں۔ میں نے بھی بحمد اللہ تعالیٰ اس حدیث سے متعلق ایک علاحدہ جز لکھا ہے۔) انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ:"قد عرضتُ هذاالحديث على شيخنا الحافظ الكبير أبي الحجاج المزي فأنكره جِدًّا، وأخبرتُهٗ أن شيخنا العلاَّمة أبا العباس ابن تيمية كان يقول:هوحديثٌ موضوعٌ، وإن كان في **سنن أبي داود**، فقال شيخنا المزي: وأناأقوله."[۳۳۴] (میں نے اپنے شیخ حافظ کبیر ابوالحجاج مزی کے سامنے یہ حدیث بیان کی تو انھوں نے اسے شدید منکر جانا اور میں نے انھیں بتایا کہ ہمارے شیخ ابوالعباس ابن تیمیہ کہا کرتے تھے کہ یہ روایت موضوع ہے اگرچہ یہ **سنن ابی داود** میں ہے، تو ہمارے شیخ مزی نے فرمایا: میں بھی اسے موضوع کہتا ہوں۔) ذہبی نے اس کے ایک اور طریق[۳۳۵] کو حمدان بن سعید بغدادی کے ترجمہ میں نقل کرکے لکھا ہے:"أتى بخبر كذب."[۳۳۶] (اس نے ایک جھوٹی

۳۳۲- ابن قیم، **تهذيب السنن**، ریاض، مكتبة المعارف للنشر و التوزيع، ج۴، ص۲۹۹

۳۳۳- ابن کثیر، **تفسیر ابن کثیر**، ج۳، ص۲۶۹

۳۳۴- ابن کثیر، **البداية والنهاية**، ج۵، ص۳۲۱

۳۳۵- خطیب بغدادی، **تاریخ بغداد**، ج۸، ص۱۷۵

۳۳۶- ذہبی، **میزان الاعتدال**، ج۱، ص۶۰۲

روایت بیان کی ہے۔) ابن حجر نے اس پر استدراک کرتے ہوئے لکھا ہے:"وهذا المتنُ لايجوزُ أن يطلق عليه الكذب فقد رواه النسائي في التفسير وأبوداود في **السنن** من طريق أخرى عن ابن عباسؓ، وأما هذه الطريق فتفَرَّدَ بها حمدان، لكن لم أرَ من ضعَّفَه قبل المؤلف."[۳۳۷] (اس متن پر کذب کا اِطلاق اور استعمال جائز نہیں، اسے نَسائی نے کتاب التفسیر میں اور ابوداود نے سنن میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے طریق سے نقل کیا ہے۔ اس طریق میں حمدان متفرد ہے لیکن میں نے مؤلف (حافظ ذہبی) سے پہلے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا ہے جس نے اسے ضعیف کہا ہو۔) اس پر البانی نے لکھا ہے کہ:"فهل رأيتَ مَن وثَّقَه، ألايكفي أنه مجهولٌ؟ لم تعرفه، و أنتَ الحافظ، إلاَّفي هذه الرواية المنكرة."[۳۳۸] (کیا آپ نے کوئی ایسا محدث دیکھا ہے جس نے حمدان کی توثیق کی ہو؟ کیا یہ کافی نہیں کہ یہ مجہول راوی ہے؟ حافظ ہونے کے باوجود آپ بھی اس راوی کو صرف اس منکر روایت میں جانتے ہیں، کسی اور روایت میں نہیں۔) ابن حجر نے اس روایت کے طرق پیش کرکے لکھا ہے:"فهذاالحديث صحيحٌ بهذه الطرق، وغفل مَن زعم أنه موضوعٌ."[۳۳۹] (ان طرق کے پیش نظر یہ حدیث صحیح ہے اور جس نے اسے موضوع کہا ہے، غفلت و وہم کا شکار ہو کر کہا ہے۔)

البانی لکھتے ہیں:

وأماتصحيح الحافظ إياه فهوغفلة منه عما تَقَدَّمَ نقله عن الحفاظ الذين أبطلوهُ بالنظر إلى متنه، وبخاصة قول شيخ الإسلام ابن تيمية: والآية مكيةٌ، ولم يكن لرسول اللهﷺ كاتبٌ بمكة، فوجود مثل هذه النكارة في الحديث مما يجعل النفسلاتطمئن لصحته من حيث إسناده، ولاسيما و مداره على مجهولين و متهم بالكذب.[۳۴۰]

۳۳۷- عسقلانی، **لسان الميزان**، ج۲، ص۳۵۶

۳۳۸- ناصر الدین البانی، **سلسلة الأحاديث الضعيفة والموضوعة**، ریاض، دار المعارف، ط۱، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲ء، ج۱۲، ص۴۰۲

۳۳۹- ابن حجر عسقلانی، **الإصابة به تمييز الصحابة**، بیروت، دار الکتب العلمیة، ط۱، ۱۴۱۵ھ، ج۳، ص۲۹

۳۴۰- ناصر الدین البانی، مرجع سابق، ج۱۲، ص۴۰۴

حافظ ابن حجر نے وہم وغفلت کا شکار ہو کر اس حدیث کو صحیح کہا ہے، اس لیے کہ حفاظ حدیث (ابن تیمیہ، مزی، ابن کثیر) نے اس کے متن کو مد نظر رکھ کر اسے باطل کہا ہے اور بالخصوص ابن تیمیہ کا یہ ارشاد کہ یہ آیت مکی ہے اور مکہ مکرمہ میں رسول اللہ ﷺ کا کوئی کاتب نہیں تھا۔ روایت میں اس نکارت کی موجودگی کے باعث دل اس کو صحیح کہنے پر مطمئن نہیں ہوتا اور سند کے لحاظ سے اس کا کوئی طریق مجہول یا متہم بالکذب راوی سے خالی نہیں تو اسے کیوں کر صحیح تسلیم کیا جائے؟

ابن جریر لکھتے ہیں: "السِّجِلُّ في هذاالموضع :الصحيفة، لأن ذلک هوالمعروف في كلام العرب، ولم يعرف لِنَبِيِّنَا كاتب اسمه السِّجِلُّ، ولا في الملائكة ملک ذلک اسمه."[۳۴۱] (یہاں سِجِلٌّ کا معنی صحیفہ ہے، اس لیے کہ کلام عرب میں یہی مشہور و معروف ہے۔ ہمارے نبی ﷺ کا سِجِلٌّ نامی کوئی کاتب معروف نہیں اور نہ ملائکہ میں اس نام کا کوئی فرشتہ موجود ہے۔)

سِجِّيْلٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ ﴾[۳۴۲] (وہ اُن کو سنگِ گِل کے قسم کے پتھروں سے مارتے تھے۔) یہ بھی وہی فارسی سے معرب اور وہی سنگِ گِل ہے جو عربی میں آکر سِجِّيْلٌ بن گیا۔ ابن قتیبہ، جوالیقی اور فریابی نے اسے فارسی کا سنگ گل ہی تسلیم کیا ہے۔[۳۴۳]

سِجِّيْنٌ

﴿ كَلَّآ إِنَّ كِتَٰبَ ٱلْفُجَّارِ لَفِى سِجِّينٍ * وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا سِجِّينٌ * كِتَٰبٌ مَّرْقُومٌ ﴾[۳۴۴] (ہر گز نہیں، فاجروں کے اعمال نامے سجین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے؟ لکھا ہوا دفتر۔) سجین یہاں اپنے لغوی مفہوم میں نہیں بلکہ ایک نام کے طور پر آیا ہے۔ وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا سِجِّينٌ کا اسلوب سجین کی خوف ناکی کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ تم کیا سمجھے کہ سجین کیا ہے! اس کو کوئی معمولی چیز نہ سمجھو۔ وہ تباہ ہوا جس کا نام یا جس کے

۳۴۱- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج۹ ص۹۵

۳۴۲- الفیل: ۴

۳۴۳- ابن قتیبہ، أدب الكاتب، ص۳۸۴؛ جوالیقی، المعرب، ص۳۶۵؛ سیوطی، الإتقان، ج۱، ص۱۸۱

۳۴۴- المطففین: ۷-۹

اعمال اس میں درج ہوئے۔ كِتَٰبٌ مَّرۡقُومٌ :وہ لکھا ہوا دفتر ہے یعنی اس میں تمام مجرموں کا سارا ریکارڈ بہ شکلِ تحریر محفوظ کیا جاتا ہے۔ "بہ شکلِ تحریر" کی قید سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نہ اس میں کسی سہو ونسیان کا کوئی اِمکان ہے اور نہ اس کے حجت ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش۔ سیوطی لکھتے ہیں: "ذكر أبو حاتم في **كتاب الزينة** أنه غير عربي" [۳۴۵] (ابو حاتم نے **كتاب الزينة** میں لکھا ہے کہ یہ غیر عربی لفظ ہے۔)

سَرَابٌ

یہ پانی کی مانند ایک چمکتا ہوا مظہر ہے اور جوں جوں پیاسا اس کی طرف بڑھتا ہے وہ آگے آگے سرکتا چلا ہے۔ پیاسا چلتے چلتے تھک جاتا ہے لیکن اُسے پانی کا گھونٹ تک نہیں ملتا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَٱلَّذِينَ كَفَرُوٓاْ أَعۡمَٰلُهُمۡ كَسَرَابِۭ بِقِيعَةٖ يَحۡسَبُهُ ٱلظَّمۡـَٔانُ مَآءً حَتَّىٰٓ إِذَا جَآءَهُۥ لَمۡ يَجِدۡهُ شَيۡـٔٗا وَوَجَدَ ٱللَّهَ عِندَهُۥ فَوَفَّىٰهُ حِسَابَهُۥۗ وَٱللَّهُ سَرِيعُ ٱلۡحِسَابِ ﴾ [۳۴۶] (اور جن لوگوں نے کفر کیا اُن کے اعمال کی تمثیل یہ ہے کہ جیسے چٹیل صحرا میں سراب ہو جس کو پیاسا پانی گمان کرے یہاں تک کہ جب اُس کے پاس آئے گا تو وہاں کچھ نہ پائے گا البتہ اس کے پاس اللہ کو پائے گا بس وہ اس کا حساب چُکا دے گا اور اللہ جلد حساب چُکانے والا ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الكلمة فارسيةٌ، مركبةٌ من:سَر:رأس، وآب:ماءٌ." [۳۴۷] (فارسی کلمہ سَرآب ہے، جو سَر اور آب سے مرکب ہے۔)

سِرَاجٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَجَعَلَ فِيهَا سِرَٰجٗا وَقَمَرٗا مُّنِيرٗا ﴾ [۳۴۸] (اور اس میں ایک چراغ اور ایک منور چاند بنایا۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الكلمة فارسية "چراغ" وقيل:سنسكريتية مِن: سورَج: الشمس." [۳۴۹] (سراج اصل میں فارسی کا چراغ ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سنسکرت کے سورَج سے ماخوذ ہے۔)

۳۴۵- سیوطی، مرجعِ سابق، ج۱، ص۱۸۱

۳۴۶- النور:۳۹

۳۴۷- تونجی، **المعرب والدخيل**، ص۱۹۸

۳۴۸- الفرقان: ۶۱

۳۴۹- تونجی، مرجعِ سابق، ص۱۹۸

سُرَادِقٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿إِنَّآ أَعۡتَدۡنَا لِلظَّٰلِمِينَ نَارًا أَحَاطَ بِهِمۡ سُرَادِقُهَا﴾[۳۵۰] (ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں اُن کو گھیر لے گی۔) جوالیقی لکھتے ہیں: "والسُّرادقُ: فارسيٌّ معربٌ، وأصله بالفارسية:سَرَادَرْ،وهو الدهليز." [۳۵۱] (یہ فارسی ہے، معرب، اصل میں سرادر تھا بمعنی درِسرا اور دہلیز کے۔) خفاجی لکھتے ہیں: "مُعَرَّبُ سَرَاپَردَه وهو ما يمدُّفوق صحن الدار والبيت." [۳۵۲] (سرا پردہ کا معرب ہے۔ مکان اور صحن پر جسے کھینچ کر پھیلایا جاتا ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الكلمة فارسية بمعنى الدهليز، الرواق، الحاجزحول الخيمة، مركبةٌ مِن:"سَر:رأسٌ، وپرده: سَتَّارةٌ." [۳۵۳] (فارسی کلمہ ہے جس کے معنی دہلیز، سائبان اور اُس پردہ کے ہیں جو خیمے کے ارد گرد ڈالا جاتا ہے۔ سرپردہ سے مرکب ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں :"الصواب:أنه معرب Srada بالفارسية القديمة وهو بالفارسية الحديثة سَرَا وسَرَايْ بمعنى البيت والقصروالبناء العالي." [۳۵۴] (درست بات یہ ہے کہ یہ قدیم فارسی Sarda کا معرب ہے جو جدید فارسی میں سرااور سرائے ہے جس کے معنی گھر، قصر وبنگلہ اوراونچی عمارت کے ہیں۔) اور ڈاکٹر صلاح الدین المنجد نے مارافرام کے حوالے سے لکھاہے: "إنها سريانيةٌ ، وليست معربيةٌ عن الفارسية وأصلها: Sarodhiqo." [۳۵۵] (یہ سریانی ہے۔ فارسی سے معرب نہیں، اس کی اصل Sarodhiqo ہے۔)

۳۵۰- الكهف:۱۸

۳۵۱- جوالیقی، مرجع سابق، ۳۹۸

۳۵۲- خفاجی، شفاء الغليل، ص۱۷۵

۳۵۳- ڈاکٹر تونجی، مرجع سابق، ۱۹۸

۳۵۴- عبدالرحیم، المعرب، ص۳۹۹

۳۵۵- ڈاکٹر صلاح الدین المنجد، المفصل في الألفاظ الفارسية المعربة، ص۸۶

سَرْدٌ

قرآن مجید میں ہے:﴿ وَأَلَنَّا لَهُ ٱلْحَدِيدَ * أَنِ ٱعْمَلْ سَٰبِغَٰتٍ وَقَدِّرْ فِى ٱلسَّرْدِ ﴾[۳۵۶] (اور ہم نے اُس کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ ڈھیلی ڈھالی زرہیں بناؤ۔)ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "السَّرْدُ:الدِّرعُ، والكلمة فارسيةٌ أصلها:زِرَه." [۳۵۷] (السَّردُ: الدِّرعُ کے معنی میں ہے۔یہ فارسی کلمہ ہے جو اصل میں زِرہ ہے۔)

سَرِيٌّ

قرآن مجید میں ہے:﴿ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴾ [۳۵۸] (تمھارے پروردگار نے تمھارے نیچے ایک چشمہ جاری کر رکھا ہے۔) ابن ابی حاتم نے مجاہد کے حوالے سے لکھا ہے کہ سریانی میں نہر کو سَرِيٌّ کہا جاتا ہے اور سعید بن جبیر کے حوالے سے لکھا ہے کہ قبطی زبان میں نہر کو سَرِيٌّ کہتے ہیں۔[۳۵۹]

ابن جوزی نے ابو صالح اور ابن جریج[۳۶۰] کے حوالے سے لکھا ہے: "هو الجَدْوَلُ بالسريانية."[۳۶۱] (سریانی زبان میں یہ جَدْوَل کو کہا جاتا ہے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "السَّرِيُّ:الجَدْوَلُ، النَّهرُ الصغيرُ،

۳۵۶- سبا: ۱۰-۱۱

۳۵۷- تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۸

۳۵۸- مریم: ۲۴

۳۵۹- ابن ابی حاتم، تفسیر ابن أبي حاتم، ج۷، ص۲۴۰۵

۳۶۰- عبد الملک بن عبد العزیز بن جریج، ابو الولید / ابو خالد۔ ۸۰ھ - ۶۹۹ء کو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے۔ حرم مکی کے فقیہ تھے۔ اپنے زمانے میں اہل حجاز کے امام تھے۔ مکہ مکرمہ میں سب سے پہلے آپ نے علوم میں کتابیں لکھیں۔ ثبت لیکن مدلس تھے۔ ۱۵۰ھ-۷۶۷ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔(ذہبی، تذكرة الحفاظ، ج۱، ص۱۶۹؛ زرکلی، الأعلام، ج ۴، ص۱۶۰)

۳۶۱- ابن جوزی، زاد المسير، ج۳، ص۱۲۶

السيد، والكلمة سريانيةٌ، أصلها:سَرِيْوٌ."[۳۶۲] (السَّرِيُّ کے معنی جدول، چھوٹے نہر اور سردار کے ہیں۔ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے، جس کی اصل سَرِیْوٌ ہے۔)

سَفَرَةٌ

قرآن مجید میں ہے:﴿ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ * كِرَامٍ بَرَرَةٍ ﴾[۳۶۳] (معزز باوقار کاتبوں کے ہاتھوں میں۔) سیوطی نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نبطی زبان میں قراء کو سَفَرَةٌ کہا جاتا ہے۔[۳۶۴] ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "السَّفَرَةُ: الملائكةُ الكاتبونَ، وهم مَن ينسخون من اللوح المحفوظ، وهم القُرَّاءُ بالنبطيةِ، من الآرامية: Soforoمعنى الكاتب."[۳۶۵] (السَّفَرَةُ:لکھنے والے ملائکہ، جو لوح محفوظ سے لکھتے ہیں۔ نبطی زبان میں اس کا استعمال قاریوں کے لیے کیا جاتا ہے جو دراصل آرامی زبان کا Soforo ہے جس کے معنی کاتب و منشی کے ہیں۔)

سَقَرٌ

قرآن مجید میں ہے:﴿ سَأُصْلِيهِ سَقَرَ * وَمَآ أَدْرَىٰكَ مَا سَقَرُ * لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ * لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴾[۳۶۶] (میں اس کو عن قریب دوزخ میں داخل کروں گا۔ اور کیا سمجھے کہ دوزخ کیا ہے؟ نہ ترس کھائے گی اور نہ چھوڑے گی۔ چمڑی کو جھلس دینے والی۔) جوالیقی لکھتے ہیں: "وسقر: اسمٌ لنارالآخرةِ، أعجميٌّ، ويقال:بل هوعربيٌّ، من قولهم: سَقَرَتْهُ الشَّمسُ إذا أذابتهُ، سميت بذلک لأنها تذيب الأجسام."[۳۶۷]

۳۶۲- تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۸

۳۶۳- عبس: ۱۵-۱۶

۳۶۴- سیوطی، الإتقان، ج۱، ص۱۸۱

۳۶۵- تونجی، مرجع سابق، ص۱۹۸

۳۶۶- المدثر:۲۶-۲۹

۳۶۷- جوالیقی، مرجع سابق، ص۳۹۵

(سقر: آخرت کے آگ کا نام ہے جو عجمی ہے۔یہ بھی کہاجاتاہے کہ یہ عربی زبان کالفظ ہے اور سَقَرَتْهُ الشَّمسُ کے معنی میں مستعمل ہے،یعنی سورج نے اُسے پگھلادیا۔ دوزخ کا یہ نام اس لیے پڑا کہ وہ بھی اجسام کو پگھلا دیتی ہے۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "درست یہ ہے کہ یہ عربی زبان کالفظ ہے۔"[۳۶۸] ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "سقر:اسم النارالآخرة، من الأرامية Chagar:الإحراق."[۳۶۹] (سقر: آخرت کے آگ کانام ہے جو آرامی زبان میں Chagar ہے جس کے معنی جلانے کے ہیں۔)

سَكَرٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمِن ثَمَرَٰتِ ٱلنَّخِيلِ وَٱلۡأَعۡنَٰبِ تَتَّخِذُونَ مِنۡهُ سَكَرٗا وَرِزۡقًا حَسَنًا﴾[۳۷۰] (اور کھجوروں اورانگوروں کے پھلوں سے بھی، تم ان سے نشہ کی چیزیں بھی بناتے ہو اور کھانے کی اچھی چیزیں بھی۔) اس آیت میں رِزْقًا کے ساتھ حَسَنًا کی صفت لگاکر ضمناً اسی طرف اشارہ کیاجاتاہے کہ کھجوراور انگوراوراس طرح کی دوسری چیزوں سے نشہ آور چیزیں تیار کرناان کا صحیح استعمال نہیں ہے، بلکہ یہ ان چیزوں کاغلط استعمال ہے۔ان کا صحیح استعمال یہی ہے کہ ان سے پاکیزہ اور صحت بخش غذا حاصل کی جائے جس سے جسم اور عقل دونوں کوتوانائی حاصل ہو، نہ کہ ان کوایسی شکل میں تبدیل کر دیاجائے کہ وہ عقل اوردل کوماؤف کر دینے والی بن جائیں۔ سیوطی لکھتے ہیں:"أخرج ابن مردويه من طريق العوفي عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال: السكر بلسان الحبشةِ:الخَلُّ."[۳۷۱] (ابن مَردَوَیہ نے عوفی کی سند سے سیدناابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیاہے کہ حبشی زبان میں سکر، سرکہ کو کہا جاتا ہے) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "من الأرامية: Chakro أوالخَلُّ بالحبشية."[۳۷۲] (آرامی زبان کے Chakro سے ہے، یاحبشی زبان سے، جس کے معنی سرکہ کے ہیں۔)

۳۶۸- عبدالرحیم، مرجعِ سابق، ص۳۹۵

۳۶۹- ڈاکٹر تونجی، مرجعِ سابق، ص۱۹۹

۳۷۰- النحل: ۶۷

۳۷۱- سیوطی، **الإتقان**، ج۱، ص۱۸۱

۳۷۲- ڈاکٹر تونجی، مرجعِ سابق، ص۱۹۹

سَلْسَبِيْلٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ عَيْنًا فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ﴾[۳۷۳] ((یہ) اس میں ایک چشمہ ہے جو سلسبیل سے موسوم ہے۔) جوالیقی لکھتے ہیں: "هواسم عجمي نكرةٌ، قال الزجاج: هوفي اللغة صفةٌ لماكان في غاية السلاسة فكأنَّ العين سميت بصفتها."[۳۷۴] (یہ عجمی نام اور نکرہ ہے۔ زجاج کے نزدیک سلسبیل کے معنی روں دواں کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام بھی محض اس کی روانی کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔) فخر الدین رازی نے لکھا ہے: "قال ابن الأعرابي: لم أسمع السلسبيل إلاَّ في القرآن، فعلى هذا لايُعرفُ لها اشتقاقٌ، وقال الأكثرون: يُقال شرابٌ سلسلٌ وسلسالٌ وسلسبيلٌ أي: عذبٌ سهل المساغ، وقد زيدت الباء في التركيب حتى صارتِ الكلمة خماسية، و دلَّت على غايةِ السلاسة."[۳۷۵] (ابن عرابی کہتے ہیں کہ میں نے سلسبیل کو قرآن مجید کے سوا اور کہیں نہیں سنا۔ اس صورت میں اس کے اشتقاق کا پتا نہیں لگایا جاسکتا۔ اکثر حضرات کا خیال ہے کہ شرابٌ سلسلٌ، سلسال اور سلسبیلٌ بولا جاتا ہے، اس میں ترکیب کے اندر "با" زائد کر دی گئی ہے جس سے کلمہ، خُماسی (پانچ حرفوں والا) ہو گیا ہے اور انتہائی خوش گواری پر دلالت کرتا ہے۔) رازی نے جو کچھ لکھا ہے، صاحبِ کشاف زمخشری کی پیروی میں نقل کیا ہے، جسے **الکشاف**، ج ۴، ص ۶۷۲ میں پڑھا جاسکتا ہے۔ ابوحیان اندلسی زمخشری کے بیان کو نقل کر کے لکھتے ہیں: " فإن كان عنى أنه زِيدَ حقيقةً فليس بِجَيِّدٍ لأن الباء ليست من حروف الزيادة المعهودة في علم النحووإن عنى أنهاحرفٌ جاء في سنح الكلمة وليس في سلسل ولافي سلسال فيصح، ويكون مماتفق معناهُ وكان مختلفاً في المادة"[۳۷۶] (اگر زمخشری کی مراد یہ ہے کہ

۳۷۳- الدهر: ۱۸

۳۷۴- جوالیقی، **المعرب**، ص ۳۸۰

۳۷۵- رازی، **التفسیر الکبیر**، ج ۱۰، ص ۷۵۲

۳۷۶- ابوحیان اندلسی، **البحر المحیط**، ج ۸، ص ۳۹۸

باء حقیقت میں زائد کر دی گئی تو درست نہیں کیوں کہ علم نحو کے اندر "ب" ان حروف میں سے نہیں ہے جو زیادت کے لیے مقرر ہیں اور اگر یہ مطلب ہے کہ حرفِ باء اثناء کلمہ میں آ گیا ہے اور سلسل اور سلسال میں نہیں ہے تو صحیح ہے اور یہ اُن میں سے ہو گا جو کہ معنی میں متفق ہیں اور مادہ میں مختلف ہیں۔)

سُلَيْمَانْ عَلَيْهِ السَّلَام

انبیاے بنی اسرائیل میں سیدنا سلیمان عَلَيْهِ السَّلَام خاص شوکت و حشمت کے مالک تھے۔ آپ سیدنا داؤد عَلَيْهِ السَّلَام کے فرزند اور وارث و جانشین تھے۔[۳۷۷] آپ کو علم اور قوتِ فیصلہ کی فراوانی عطا ہوئی تھی۔[۳۷۸] جوالیقی لکھتے ہیں: "سُليمان اسم النبي عبراني، وقد تكلمت به العربُ في الجاهلية قال المعري: ولاأعلم أنهم سَمُّوابه... وإنماسُمِّي الناسُ بهذا الإسم لما شاع الاسلامُ ونزل القرآن." [۳۷۹] (سلیمان عَلَيْهِ السَّلَام نبی کا نام ہے۔ عبرانی ہے اور عرب کے جاہلیت کے زمانے میں مستعمل ہے۔ معری کہتے ہیں: مجھے نہیں معلوم کہ زمانۂ جاہلیت میں کسی کا یہ نام رہا ہو، البتہ جب اسلام کا نور پھیل گیا اور قرآن مجید نازل ہوا تو لوگوں نے یہ نام اپنے بچوں کے لیے رکھنا شروع کیا۔) ڈاکٹر عبدالرحیم نے جفری کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس نام کی اصل عبری میں سلومون، سریانی میں شلیمو یا شلیمون اور یونانی میں سلومون ہے اور بہ ظاہر ایسا لگتا ہے کہ یہ سریانی سے عربی میں آیا ہے۔[۳۸۰]

سَنَا

قرآن مجید میں ہے: ﴿ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِۦ يَذْهَبُ بِٱلْأَبْصَٰرِ ﴾ [۳۸۱] (اس کی بجلی کی کوند، معلوم ہوتا ہے کہ نگاہوں کو اُچک لے گی۔ ابن فارس نے لکھا ہے: "وأمَّاالذي يدُلُّ على الرفعةِ فَالسَّنَآءُ، ممدودٌ،

۳۷۷- النمل: ۱۶

۳۷۸- النمل: ۱۵

۳۷۹- جوالیقی، المعرب، ص ۳۸۱

۳۸۰- عبدالرحیم، هامش المعرب، ص ۳۸۲

۳۸۱- النور: ۴۳

وكذلک إذا قصرته دَلَّ على الرفعةِ، إلاَّ أنه مخصوصٌ، وهوالضوءُ." [۳۸۲] (سَنَآءٌ (ممدود) بلندی اور ارتفاع پر دلالت کرتا ہے اور سَنَا (مقصور) مخصوص بلندی اور ارتفاع پر یعنی روشنی کی بلندی پر۔) ابن حجر عسقلانی نے ایک نظم کہی ہے جن میں ان الفاظ کو شمار کیا ہے جن کو معرب بتایا گیا ہے، اس میں سَنَا بھی مذکور ہے۔"صُرهُنَّ اِصْرِيْ وِغِيْضَ الْمَاء مَعَ وِزْرٍ ثُمَّ الرَّقِيْمُ مَنَاصٍ و السَّنَا النُّورُ."[۳۸۳] مگر سیوطی لکھتے ہیں: "عَدَّهُ الحافظ ابن حجر في نظمه ولم أقف لغيره."[۳۸۴] (حافظ ابن حجر نے اسے معرب میں شمار کیا ہے، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کسی اور نے بھی ایسا کہا ہو۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "والكلمة حبشيةٌ، معناها:حَسَنٌ." [۳۸۵] (حبشی زبان کا کلمہ ہے جس کا معنی حَسَنٌ (نہایت اچھے اور عمدہ) کے ہیں۔)

سُنْدُسٌ

قرآن مجید میں اس کا ذکر تین مقامات پر ہوا ہے: ﴿وَيَلْبَسُونَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ﴾[۳۸۶] (وہ سندس اور اِستبرق کی سبز پوشاک پہنیں گے۔) ﴿يَلْبَسُونَ مِن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ﴾[۳۸۷] (وہ سندس اور اِستبرق کی پوشاک پہنیں گے۔) ﴿عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ﴾[۳۸۸] (اُن کے اوپر سندس کا سبز اور استبرق کا لباس ہوگا۔) جوالیقی لکھتے ہیں:"السُّندُسُ:رقيقُ الديباج، لم يختلف فيه

۳۸۲- ابن فارس، **معجم مقاييس اللغة**، باب السين و النون وما يثلثهما،مادہ: سنح

۳۸۳- عسقلانی، **فتح الباري**،ج ۸،ص۲۵۳

۳۸۴- سیوطی،**الإتقان**،ج۱،ص۱۸۱

۳۸۵- ڈاکٹر محمد تونجی،**المعرب والدخيل**،ص۱۹۹

۳۸۶- الكهف:۳۱

۳۸۷- الدخان: ۵۳

۳۸۸- الدهر: ۲۱

المفسرون."[۳۸۹] (باریک دیبا کو سندس کہا جاتا ہے، اس میں مفسرین کے مابین کوئی اختلاف نہیں۔) خفاجی بھی اسے معرب ہی مانتے ہیں۔[۳۹۰] ڈاکٹر عبدالرحیم نے مستشرق Dvork کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ یونانی زبان کے سَنْدِکُس سے معرب ہے۔[۳۹۱] اور معجم یونانی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ کلمہ آشوری زبان کے Samutu، Sadu سے ماخوذ ہے۔[۳۹۲] ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "ضربٌ من الثياب الخضر من رقيق الديباج، فارسية."[۳۹۳] (باریک سبز دیبا کا لباس ہے اور فارسی سے معرب ہے۔) سیوطی نے شیدلہ کے حوالے سے لکھا ہے: یہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔[۳۹۴]

سَيِّدَهَا

قرآن مجید میں ہے: ﴿ سَيِّدَهَا لَدَا ٱلْبَابِ ﴾ [۳۹۵] (اور دونوں نے اُس کے شوہر کو دروازے پر پایا۔ عبدالعزیز بن عبدالسلام سلمی اور سیوطی لکھتے ہیں: "أي: زوجها، بلسان القبط."[۳۹۶] (یعنی اُس (عورت کا) شوہر۔ قبطی زبان کا لفظ ہے)

سِيْنِيْنَ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَطُورِ سِينِينَ ﴾ [۳۹۷] (اور طورِ سینین) مولانا حمید الدین فراہی لکھتے ہیں: قرآن نے اس کو ایک جگہ ﴿ طُورِ سَيْنَآءَ ﴾ [۳۹۸] بھی کہا ہے، یعنی ایک جگہ وہ مؤنث کی صورت میں ہے

۳۸۹- جوالیقی، **المعرب**، ص۳۶۱

۳۹۰- خفاجی، **شفاء الغليل**، ص۱۷۵

۳۹۱- عبدالرحیم، هامش **المعرب**، ص۳۶۱

۳۹۲- عبدالرحیم، نفس سابق،، ص۳۶۲

۳۹۳- ڈاکٹر تونجی، **المعرب والدخيل**، ص۱۹۹

۳۹۴- سیوطی، **الإتقان**، ج۱، ص۱۸۲

۳۹۵- **يوسف: ۲۵**

۳۹۶- تفسیر عز بن عبدالسلام، ج۱، ص۳۰۰؛ سیوطی، مرجع سابق، ج۱، ص۱۸۲

۳۹۷- التين: ۲

۳۹۸- المؤمنون: ۲۰

اور دوسری جگہ جمع سالم کی شکل میں، اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کی تانیث اس وجہ سے ہے کہ یہ جمع کی صفت ہے۔ جیسے عربی میں جَمْعًا اور اَجْمَعُوْنَ مستعمل ہیں۔ تورات میں کہیں سیناآیا ہے ، کہیں سینیم، اور معلوم ہے کہ عبرانی میں "یم" جمع کی علامت ہے۔[۳۹۹] ابن جریر عکرمہ کے حوالے سے لکھتے ہیں: "هو الحسن، وهي لغة الحبشةِ، يقولون للشيء الحسن:سيناسينا...وسينين:حسن بالحبشية."[۴۰۰] (خوب صورت کے معنوں میں ہے۔ حبشی زبان کا لفظ ہے۔ وہ خوب صورت چیز کو سینا سینا کہتے ہیں۔ سینین بھی حبشی زبان میں خوب صورت ہی کو کہتے ہیں۔) جوالیقی بھی اسے معرب تسلیم کرتے ہیں۔[۴۰۱] ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: عبرانی میں یہ سینا، یونانی میں "سیناو سینین" اور سریانی میں طورِسِینَیْ ہے۔[۴۰۲]

سِیْنَاءَ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِن طُورِ سَيْنَاءَ تَنۢبُتُ بِٱلدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْءَاكِلِينَ ﴾[۴۰۳] (اور (وہ) درخت (بھی اُگایا جو) طور سینا میں پیدا ہوتا ہے، وہ روغن اور کھانے والوں کے لیے سالن کے ساتھ اُگتا ہے۔ سید آلوسی بغدادی لکھتے ہیں:

"والأكثرونَ على أنه ليس بعربي بل هو إِمَّا نبطيٌّ أوحبشيٌّ، و أصل معناهُ:الحسن أوالمبارك، وجوز بعضٌ أن يكون عربيًا من السنأء بالمد، وهو الرفعة أو السَّنَا بالقصر وهوالنور، وتعقبه أبوحيان بأَنَّ المادَّتين مختلفتان لأن عين السناء أو السَّنَا نونٌ، وعين سنا يائٌ ، ورُدَّ بأنَّ القائل بذلک يقول : إنه فيعالٌ، ويجعل عينه النون و ياءه مزيدةٌ وهمزته منقلبةٌ عن واوٍ."[۴۰۴]

(اکثر اس پر ہیں کہ سینا عربی نہیں ہے، بلکہ یا تو نبطی ہے یا حبشی اور اس کے اصل معنی اچھے یا مبارک کے ہیں، بعض اس کا عربی ہونا بھی تجویز کرتے ہیں، یا تو سَنَأءٌ بالمد سے جس کے معنی رفعت کے ہیں یا سَنَا بالقصر سے جس کے معنی نور کے

۳۹۹- حمید الدین، **مجموعہ تفاسیر فراہی**، ص ۳۱۲-۳۱۳

۴۰۰- ابن جریر، **تفسیر ابن جریر**، ج ۱۲، ص ۶۳۳

۴۰۱- جوالیقی، مرجع سابق، ص ۳۹۲

۴۰۲- عبدالرحیم، مرجع سابق، ص ۳۹۳

۴۰۳- المؤمنون:۲۰

۴۰۴- الوسی، **روح المعاني**، ج ۱۷-۱۸، ص ۳۰۵

ہیں۔ ابوحیان نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ دونوں مادے مختلف ہیں کیوں کہ سَنَأ (مد کے ساتھ) ہو یا سَنَا (قصر کے ساتھ) دونوں کا عین کلمہ نون ہے اور سِیْنَاءٌ کا عین کلمہ یا ہے، مگر یہ اس طرح رد کیا گیا ہے کہ جو اس کا قائل ہے وہ اس کا وزن فیعال بتاتا ہے۔ عین کلمہ نون، یا کو زائد اور ہمزہ کو واو سے تبدیل شدہ قرار دیتا ہے۔)

شَطْرٌ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ ٱلْمَسْجِدِ ٱلْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّوا۟ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُۥ ﴾ [۴۰۵] (تو تم اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کرو اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے اُسی کی طرف کرو۔) شَطْر کے معنی جہت، جانب اور طرف کے ہیں۔ مسجدِ حرام سے مراد وہ مسجدِ محترم ہے جو بیت اللہ کو اس کی ہر جہت سے ہالہ کی طرح اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ قبلہ تو دراصل بیت اللہ ہی ہے، چناں چہ مسجدِ حرام کے اندر لوگ ہر چہار طرف سے بیت اللہ ہی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں، لیکن باہر والوں کے لیے یہ مسجد بھی قبلے ہی کے حکم میں داخل ہے۔ اسی طرح امت کے لیے قبلے کے معاملہ میں تھوڑی سی وسعت اور آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ سیوطی نے ابن ابی حاتم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رفیع کے حوالے سے بتایا کہ حبشی زبان میں شَطْرٌ کے معنی تِلْقَاءٌ (سمت اور جہت) کے ہیں۔ [۴۰۶]

شَهْرٌ

ابن فارس لکھتے ہیں: "يَدُلُّ على وُضُوحِ الأمرِ وإضائَةٍ." [۴۰۷] (اس کے بنیادی معنی کسی معاملہ کا واضح ہونا اور روشن ہونا ہوتے ہیں۔) قرآن مجید میں ہے: ﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [۴۰۸] (رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن اُتارا گیا لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔) جوالیقی نے ثعلب کے حوالے سے لکھا ہے: "سُمِّي شهراً لشهرته وبيانه؛ لأنَّ النَّاسَ يَشْهَرونَ دخولَه

۴۰۵- البقرة: ۱۴۴

۴۰۶- سیوطی، مرجعِ سابق، ج۱، ص ۱۸۲

۴۰۷- ابن فارس، مصدرِ سابق، ص ۵۱۸

۴۰۸- البقرة: ۱۸۵

وخروجَه."[۴۰۹] (مہینے کا نام شَهْرٌ اس لیے ہوا کہ لوگوں میں اس کے شروع ہونے اور گزر جانے کی شہرت ہوتی ہے۔) جوالیقی لکھتے ہیں: "بعض اہل لغت کے نزدیک شَهْرٌ سریانی زبان کے کلمہ سَهْرٌ کا معرب ہے۔"[۴۱۰]

صِرَاطٌ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ اَهْدِنَا الصِّرَطَ الْمُسْتَقِيمَ ﴾ [۴۱۱] (چلا ہمیں سیدھی راہ۔) ڈاکٹر عبدالرحیم لکھتے ہیں: "الصِّرَاطُ لاتينيٌّ، وأصله (Strata) Viaأي:الطريق المبلط."[۴۱۲] (صراط لاطینی زبان کا لفظ ہے، جس کی اصل Strata ہے، جس کے معنی ہموار راستہ کے ہیں۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "الصراط: الطريقُ والشارعُ، والكلمة يونانيةٌ من:Strata، استخدمها العرب مجازاً للمنهجِ، والحق، والوسط."[۴۱۳] (صراط کے معنی شارع اور راستہ کے ہیں۔ یہ یونانی کلمہ Strata سے ہے۔ اہل عرب نے اسے مجازاً منہج، حق اور وسط کے لیے استعمال کیا ہے۔)

صُرْهُنَّ

قرآن مجید میں ہے: ﴿ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ﴾ [۴۱۴] (آپ چار پرندے لے لیں اور اُن کو اپنے سے مانوس کر لیں پھر ان کو ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پر اُن کا ایک ایک حصہ رکھ دیں۔) صَوَرٌ کے معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ صُرْتُ الشَّيء یا أَصَرْتُ الشَّيء کے معنی ہوں گے: "میں نے اس کو اپنی طرف مائل کر لیا، جھکا لیا، اپنے سے اس کو مانوس کر لیا۔ اسی سے فَصُرْهُنَّ ہے، یعنی ان پرندوں کو اپنے سے مانوس کر لو۔" مفسر ابن جریر لکھتے ہیں: یہ لفظ صار یصورُ

۴۰۹- جوالیقی، مصدرِ سابق، ص ۴۱۰

۴۱۰- جوالیقی، مصدرِ سابق، ص ۴۱۰

۴۱۱- الفاتحة: ٦

۴۱۲- عبدالرحیم، مرجعِ سابق، ص ۱۵۵

۴۱۳- ڈاکٹر تونجی، مرجعِ سابق، ص ۲۰۰

۴۱۴- البقرة: ۲٦۰

اور صارَ یصیرُ دونوں سے پڑھا گیا ہے اور لفظِ مشترک ہے بمعنی: مائل کرنا اور مانوس کرنا اور اور پارہ پارہ اور ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور بعض نے کہاہے کہ بالکسر بمعنی قطع کرنا اور بالضم بمعنی مائل کرنا اور بعض نے کہاہے کہ بالضم تو دونوں معنوں میں مشترک ہے اور بالکسر فقط بمعنی قطع کرناہے۔[۴۱۵] اسی لحاظ سے یہ لفظ عربی ہے۔ابن جریر نے سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے لکھاہے کہ یہ نبطی زبان سے معرب ہوا ہے جس کے معنی قطع کرنے (یعنی: کاٹ ڈالنے) کے ہیں۔[۴۱۶] ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں: "ذكر صاحب المغرب أن هذه اللفظة بالسريانية وقيل بالنبطية لكن المنقول أولاً يدُلُّ على أنها بالعربية."[۴۱۷] (صاحبِ مغرب نے ذکر کیا ہے کہ یہ لفظ سریانی ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ نبطی ہے لیکن سابق میں جو نقل ہوا وہ اس کو بتاتا ہے کہ یہ عربی ہے۔)

صَلَوَاتٌ

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوْلَا دَفْعُ ٱللَّهِ ٱلنَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَٰمِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَٰتٌ وَمَسَٰجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا ٱسْمُ ٱللَّهِ كَثِيرًا﴾[۴۱۸] (اوراگر اللہ لوگوں کوایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کانام لیاجاتاہے ڈھائے جاچکے ہوتے۔) مَسَاجِد، مَسجِد کی جمع ہے، جومسلمانوں کی مساجدکے لیے معروف ہے۔صَوَامِع، صُوْمَعَةٌ کی جمع ہے۔اصلاًیہ لفظ اُن بلند پہاڑوں اور مکانوں کے لیے آتاہے جہاں عیسائی راہب عبادت کے لیے خَلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہیں، اس وجہ سے اس کاترجمہ خانقا ہیں زیادہ موزوں ہے۔بِيَعٌ، بِيْعَةٌ کی جمع ہے۔یہ یہوداور نصاریٰ دونوں کے عبادت خانوں کے لیے استعمال ہوتاہے، لیکن آگے یہود کے عبادت خانوں کے لیے الگ لفظ آیاہے، اس لیے اقرب یہ ہے کہ اس سے مراد نصاریٰ کے گرجے ہیں۔ان کے ہاں رہبانیت کے نظام کی وجہ سے خانقاہوں اور گرجوں دونوں کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے۔صَلَوَاتُ، صَلاَةٌ کی جمع ہے۔یہ لفظ

۴۱۵- ابن جریر، تفسیر ابن جریر، ج۳، ص۵۳-۵۵

۴۱۶- ابن جریر، نفسِ مصدر، ج۳، ص۵۵

۴۱۷- عسقلانی، فتح الباري، ج۸، ص۲۰۱

۴۱۸- الحج: ۴۰

یہود کے کنیسوں کے لیے آتا ہے۔عبرانی میں اس کی اصل صَلُوْتَا ہے۔جوالیقی کی یہی رائے ہے۔[۴۱۹]
زمخشری لکھتے ہیں: "سُمِّيَتِ الكنيسةُ صلاة لأنه يُصَلَّى فيها، وقيل:هي كلمةٌ معربةٌ، أصلها بالعبرانية صلوثا."[۴۲۰] (کنیسہ کو صلاۃ اس لیے کہا گیا کہ وہاں بھی عبادت کی جاتی ہے۔یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ کلمہ معرب ہے، جس کی اصل عبرانی میں صلوثا ہے۔)

صَنَمٌ

راغب اصفہانی لکھتے ہیں:
الصَّنَمُ جُثَّةٌ مُتَّخَذَةٌ مِن فِضَّةٍ أونُحاسٍ أوخَشَبٍ كانوا يعبدونهامتقربين به إلى اللهتعالى، وجمعه أصنامٌ... قال بعضُ الحكماء:كُلُّ ماعُبِدَ من دون الله، بل كلُّ مايُشغِلُ عن اللهتعالى يُقال له صَنَمٌ، وعلى هذا الوجهِ قال إبراهيمعَلَيْہِ السَّلَام:وَاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ، فمعلومٌ أنَّ إبراهيمعَلَيْہِ السَّلَام مع تحققه بمعرفةالله تعالى واطلاعه على حكمته لم يكن ممن يخاف أن يعود إلى عبادة تلك الجُثَثِ التي كانوايعبدونها فكأنه قال: اجنبني عن الاشتغال بمايَصْرِفُنِي عنك.[۴۲۱]
(الصَّنَمُ کے معنی بُت کے ہیں جو چاندی، پیتل یا لکڑی وغیرہ کا بنا ہوا ہو۔لوگ ان چیزوں کے مجسمے بنا کر اُن کی پوجا کرتے تھے اور انھیں تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔صَنَمٌ کی جمع اَصْنَامٌ ہے...بعض حکما نے کہا ہے کہ ہر وہ چیز جسے اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا جائے، بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کو اللہ تعالیٰ سے بے گانہ بنادے اور اس کی توجہ کو کسی دوسری جانب منعطف کردے صَنَمٌ کہلاتی ہے۔چناں چہ سیدنا ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے دعا مانگی تھی کہ: ﴿وَٱجۡنُبۡنِي وَبَنِيَّ أَن نَّعۡبُدَ ٱلۡأَصۡنَامَ﴾[۴۲۲] (مجھے اور میری اولاد کو اس سے محفوظ رکھنا کہ ہم اَصنام کی عبودیت اختیار کریں۔)تو اس سے مراد ایسی ہی چیزوں کے پیچھے لگ جانا تھا، کیوں کہ سیدنا ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کو اس کا اندیشہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ اور اُن کی اولاد بت پرستی شروع کرے گی۔)
فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

۴۱۹- جوالیقی، مصدرِ سابق، ص۴۱۹
۴۲۰- زمخشری، تفسیر الکشاف، ج۳، ص۱۶۰
۴۲۱- راغب اصفہانی، المفردات، ص۲۸۷
۴۲۲- إبراهيم:۱۴

إنهم وضعواهذه الأصنام والأوثان على صورأنبيائهم وأكابرهم، وزعموا أنهم متى اشتغلوا بعبادة هذه التماثيل، فإنَّ أولئک الأكابر تكون شفعاء لهم عند اللهتعالى، ونظيره في هذا الزمان اشتغال كثيرمن الخلق بتعظيم قبورالأكابر، على اعتقاد أنهم إذاعَظَّموا قبورهم فإنهم يكونون شفعاء لهم عندالله تعالى.[۴۲۳]

(ان مشرکوں نے یہ اَصنام واَوثان اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی صورتوں پر بنائے تھے اورانھوں نے یہ خیال کیاتھا کہ جب وہ اُن کی مورتیوں کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو یہ اکابر اور بزرگ اُن کے حق میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارش کرتے ہیں اوراس کی نظیر اس زمانے میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ بزرگوں کی قبروں کی اس اعتقاد کے تحت تعظیم کرتے ہیں کہ اس طریقے سے وہ بزرگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اُن کی سفارش کرتے ہیں۔)

خفاجی لکھتے ہیں: "صنم: معرب شَمَن، وهوالوثن"[۴۲۴] (شَمَن کا معرب ہے جس کے معنی بت کے ہیں۔)

ضَنْکٌ

ارشادِ ربانی ہے: ﴿ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِى فَإِنَّ لَهُۥ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُۥ يَوْمَ ٱلْقِيَـٰمَةِ أَعْمَىٰ ﴾[۴۲۵] (اور جو میری یاددہانی سے منہ اِعراض کرے گا تو اس کے لیے ضیق کی زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا اُٹھائیں گے۔) ڈاکٹر محمد تونجی لکھتے ہیں: "اَلضِّيقُ والضَّعف، من الفارسية تنگ." [۴۲۶] (تنگی اور ضعف کو کہتے ہیں، فارسی کے "تنگ" سے معرب ہے۔)

(جاری ہے)

❁❁❁❁❁❁

۴۲۳- رازی، **التفسیر الکبیر**، ج ۶، ص ۲۲۷

۴۲۴- خفاجی، **شفاء الغلیل**، ص ۱۹۸

۴۲۵- طٰہٰ: ۱۲۴

۴۲۶- ڈاکٹر تونجی، مرجعِ سابق، ص ۲۰۰